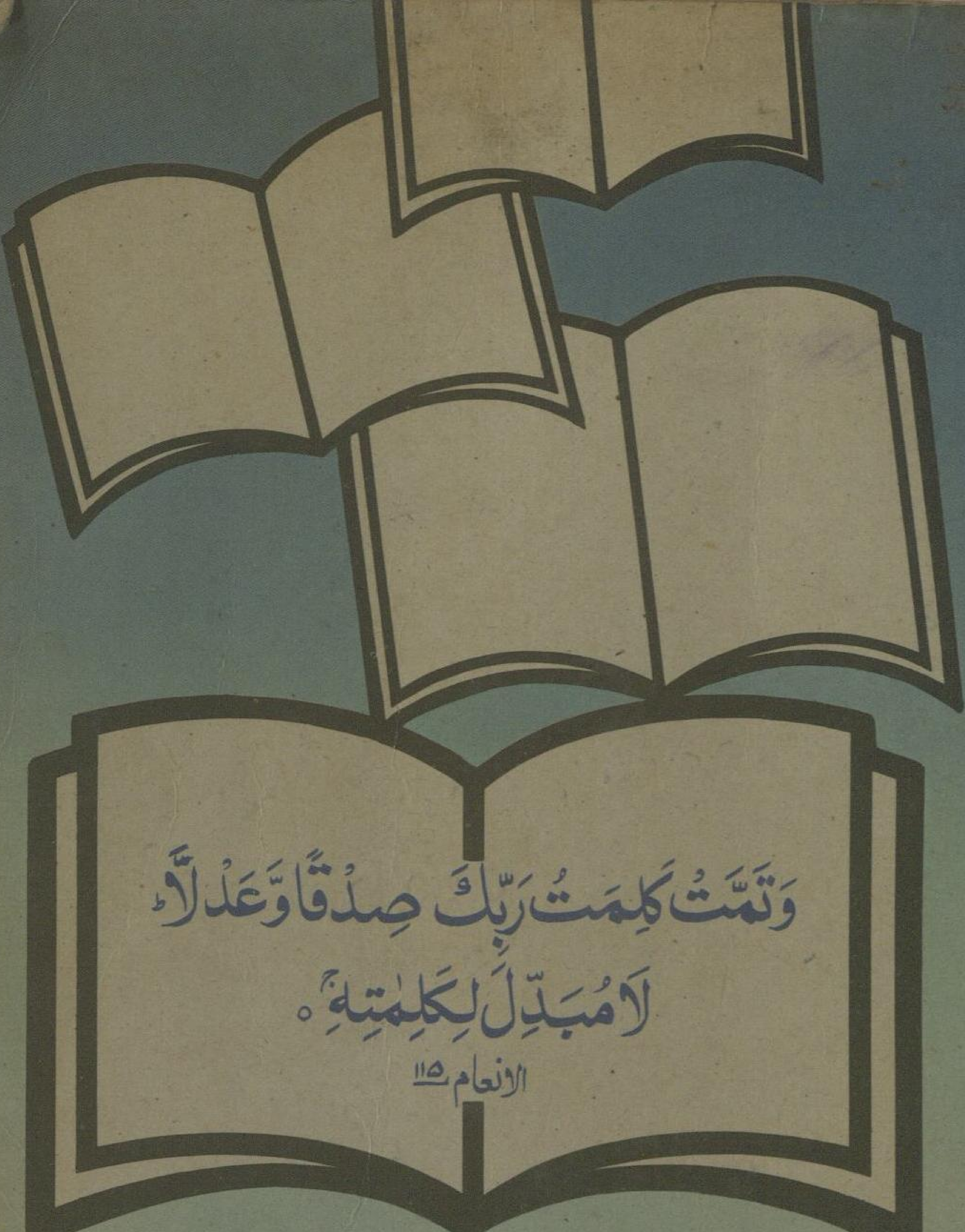


مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں

پرویز

بِاسْمِہٖ تعالےٰ

مذاہبِ عالم
کی
آسمانی کتابیں

جس میں مستند
تاریخی شواہد کی رُو سے بتایا گیا ھے کہ
قرآنِ کریم کے سوا، کسی مذہب کی
آسمانی کتاب اپنی اصلی
شکل میں موجود نہیں

پرویزؔ

طلوعِ اسلام (ٹرسٹ) (رجسٹرڈ) ۲۵۔بی گلبرگ ۲، لاہور۔ ۱۱

طلوع اسلام ٹرسٹ کی مطبوعات سے حاصل ہونے
والی جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

فہرستِ مشمولات

مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں

مضمون	صفحہ
تعارف (طبع اوّل)	۱۱
۱۔ یہودیت	
تورات سے کون سی کتابیں مقصود ہیں ؟	۱۵
ایک وقت ایسا بھی آیا تھا کہ یہ کتابیں دنیا سے مفقود ہو چکی تھیں ۔	۱۶
عزرا نبی نے تورات کو از سرِ نو مرتب کیا ۔	۱۷
لیکن کس طرح مرتب کیا ؟	۱۹
عزرا نے محض حافظے کی مدد سے مرتب کیا ۔	۱۹
خود عزرا کا بیان ۔	۱۹
تورات مرتب کرنے کا دلچسپ قصہ ۔	۲۰
یہ مجموعے پھر تباہ ہو گئے اور از سرِ نو مرتب کیے گئے ۔	۲۱
پھر تیسری تباہی ۔	۲۲
لیکن جوزیفس کچھ اور ہی کہتا ہے ۔	۲۲
یہودیوں کے دو فرقے ، صدوقی اور فریسی ۔	۲۳
وحی کی دو قسمیں ، مکتوب اور غیر مکتوب ۔	۲۳
مثنا ، جمارا ، تالمود ۔	۲۳

مضمون	صفحہ
باطنی تعلیم کا سلسلہ	۲۴
اپوکریفہ (یعنی جعلی) لٹریچر۔	۲۴
یہ کتابیں بھی اپنی اصل زبان میں نہیں، بلکہ یونانی زبان میں ہیں۔	۲۵
عبرانی نسخہ بھی یونانی کا ترجمہ ہے۔	۲۶
ان نسخوں میں باہمی اختلافات۔	۲۶
مستند نسخے کے دو ایڈیشنوں میں اختلافات۔	۲۸
نگہ باز گشت	۳۲
۲۔ عیسائیت	
حضرت عیسیٰؑ کی ابتدائی زندگی کے حالات ابھی تک گمنامی کے گوشے میں پڑے ہیں۔	۳۵
ایسینی فرقہ کے ذرا تفصیلی حالات۔	۳۶
حضرت عیسیٰؑ کے حواری غالباً اسی فرقہ کے لوگ تھے۔	۳۷
ان کا نام کرسچن کس طرح سے رکھا گیا؟	۳۷
سینٹ پال نے اس مذہب کی تبلیغ کو عام کر دیا۔	۳۷
انجیل کی ترتیب و تدوین۔	۳۹
موجودہ اناجیل کا انتخاب کس طرح عمل میں آیا؟	۴۰
متی کی انجیل۔	۴۰
مرقس کی انجیل۔	۴۱
لوقا کی انجیل۔	"
یوحنا کی انجیل۔	"
ان اناجیل اربعہ کے متعلق محققین کی آراء۔	"
اناجیل کے قدیمی نسخے۔	۴۳

مضمون	صفحہ
انجیل کے تراجم۔	۴۴
ان کے باہمی اختلافات۔	۴۴
ٹرنٹ کی کونسل کی روئیداد۔	۴۵
اناجیل میں تحریف والحاق بہت پہلے سے شروع ہو گیا تھا۔	۴۶
جھوٹ بہت بڑی "نیکی" کا کام ہے۔ (سینٹ پال)	۴۷
عیسائیوں کے عقائد۔	۴۹
نجات اعمال سے نہیں، کفّارہ کے عقیدہ سے وابستہ ہے۔	۵۱
"معافی نامے" اور ان کی تجارت۔	"
لوتھر کی اصلاحی کوشش۔	۵۴
عیسائیوں کے فرقے۔	۵۴
نگہِ بازگشت۔	۵۵
تکملہ۔ تورات وانجیل کے متعلق۔	۵۸
۳۔ مجوسیت (مذہب زرتشت)	
جناب زرتشت کے سوانح حیات کے متعلق قیاس آرائیاں۔	۶۰
اور تو اور آپ کا زمانہ بھی متعین نہیں ہو سکا۔	۶۱
ژنداوستا (مذہبی کتاب) کیا ہے؟	۶۲
یہ کس طرح مرتّب ہوئی؟	۶۲
اور کس طرح ضائع ہو گئی؟	۶۳
نسک، یسنا، وساتیر۔	۶۳
ثنویّت کا عقیدہ۔	۶۵
جناب زرتشت کے علاوہ ایک اور ہستی .... متھرا۔	۶۶

مضمون	صفحہ
آنے والے کا عقیدہ۔	٦٧
یہودیت، عیسائیت، ہندومت میں اور مسلمانوں کے ہاں بھی!	٦٧
(اسکندریہ کی لائبریری اور عیسائی)۔	٦٨
نگہِ بازگشت۔	٦٩
۴۔ ہندومت	
دشوارگزار اور نازک ترین مرحلہ۔	٧٠
دشوارگزار اس لئے کہ آج تک یہ بھی متعین نہیں ہو سکا کہ ہندو کسے کہتے ہیں؟	٧٠
اس کے لئے کسی شرط کی ضرورت نہیں۔	٧١
ہندو وہ ہے جو یہ کہہ دے کہ میں ہندو ہوں۔	٧١
منوجی اور مہابھارت کی شہادات۔	٧۴
ایک اور بڑی دِقّت! ہندوؤں کی تاریخ محفوظ نہیں۔	٧۴
جب تاریخ محفوظ نہیں تو زمانہ کا تعیّن بھی نہیں ہو سکتا۔	٧٧
وید	
یہ کسی خاص کتاب کا نام نہیں۔	٧٨
شروع میں وید ایک ہی تھا۔	٧٩
یہ بھی ضائع اور مفقود ہو چکا ہے۔	٧٩
ویدوں کی تصنیف کا زمانہ۔	٨٠
آریہ کون تھے، کہاں سے آئے تھے؟	٨١
ایرانی اور آریاؤں کی زبان اور عقائد کا اشتراک۔	٨٣
سنگراچہ اور ویاس جی خود جناب زرتشت کے پاس گئے تھے۔	٨٣

مضمون	صفحہ
وہیں سے یہ مذہب لائے۔	۸۴
مذہب زرتشت اور ویدوں کی تعلیم میں مشابہت۔	۸۴
ویدوں کے زمانہ تصنیف کے متعلق تحقیقاتِ جدیدہ۔	۸۵
وید سب سے پہلے کب ضبطِ تحریر میں آئے؟	۸۶
مختلف تحقیقات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا جا سکتا ہے کہ وید ۱۰۰۰ء سے پہلے نہیں لکھے گئے۔	۸۷
ویدوں کے مصنف کون تھے؟	۸۷
عجیب وغریب قسم کے رشی (مچھلیاں، کتیا، کبوتر، نیل کنٹھ، سانپ، جوئے کا پانسہ، دریائے ستلج و بیاس وغیرہ)	۸۸
ویدوں کے اندر لکھا کیا ہے؟ اسے پیش کرنے کی جرأت کسے ہو سکتی ہے؟ پرنسپل گرفتھ (ویدوں کے مترجم) تک کو نہیں ہوئی۔	۹۲
ویدوں میں خدا کا تصوّر۔	۹۵
برہما، شِو اور وِشنو۔	۹۶
ویدوں کے دیوتا۔	۹۷
معاملات کی دنیا میں عجیب وغریب تعلیم۔	۹۸
ویدوں کے علاوہ دوسرا لٹریچر	
برہمن، آرنیک، اُپ نشد۔	۹۹
ویدانت کا فلسفہ (وحدت الوجود)۔	۱۰۰
چھ شاستر، (آستک اور ناستک ہندو)۔	۱۰۲
پُران۔	۱۰۳
پُرانوں کی تعلیم کی دو ایک مثالیں۔	۱۰۴

مضمون	صفحہ
رامائن و مہابھارت ۔	۱۰۵
گیتا ۔	۱۱۳
شری کرشن جی کے متعلق مہابھارت کی ایک روائیت ۔	۱۱۴
آپ کی تعلیم کے نتائج کے متعلق ہندو اکابر کی آراء ۔	۱۱۵
۵ ۔ بُدھ مت	
مہاتما بدھ کی تعلیم سب زبانی تھی ۔	۱۱۷
ان کی تعلیم ان کی وفات کے بعد تین کونسلوں کے ذریعے مرتب ہوئی ۔	//
بدھ مت کے فرقے اور لٹریچر ۔	۱۱۸
۶ ۔ جین مت	
جین مت کے فرقے اور ان کا لٹریچر ۔	۱۱۹
ستیارتھ پرکاش ۔	۱۲۰
ایک ضمنی بحث ۔	//
آریوں کے متعلق تحقیقاتِ جدیدہ کا رُخ ۔	۱۲۱
۷ ۔ اہل چین کے مذاہب	
۱ ۔ کنفیوشس اِزم	۱۲۴
اس کا انتساب جناب کنفیوشس کی طرف ضرور ہے ۔	۱۲۴
لیکن وہ اس کا بانی نہیں ۔	//
انہوں نے کوئی آسمانی صحیفہ بھی نہیں دیا ۔	//
یہ مذہب خود اپنے آسمانی ہونے کا مدعی نہیں ۔	۱۲۵

مضمون	صفحہ
اس مذہب کی اہم کتابوں کا تعارف۔	۱۲۶
تعلیم اور عقائد۔	۱۲۷
۷۔ طاؤازم	
یہ (LAOTZE) کی طرف منسوب ہے لیکن اس کے بانی وہ بھی نہیں۔	۱۲۹
اس کتاب میں خدا کا ذکر کیسے آیا ہے؟	〃
اس کی تعلیم عجیب و غریب قسم کی ہے۔	۱۳۰
منتہائے کمال درازئ عمر کا فن سیکھنے میں ہے۔	〃
اور علم و دانش سے دُور رہنے میں۔	〃
تین مجسّموں کی پرستش۔	〃
۸۔ اہل جاپان کے مذہب	
(شنٹوازم)	۱۳۲
سورج کی دیوی کی پرستش، اصل مرکز۔	۱۳۲
مختلف دیوی دیوتا۔	۱۳۳
اسلاف کی پرستش، شاہنشاہی پرستش۔	۱۳۳
نگہ بازگشت۔	۱۳۴
قرآن مجید	
اس کتاب کی خصوصیات۔	۱۳۵
اندرونی شہادات کہ قرآن رسول اللہؐ کی زندگی میں لکھا بھی گیا تھا اور محفوظ بھی کر لیا گیا تھا۔	۱۳۷

صفحہ	مضمون
۱۳۹	نبی اکرمؐ خود بھی لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔
۱۳۹	کتابت کے علاوہ اسے حفظ بھی یاد کیا جاتا تھا۔
۱۴۱	اس کے مستند نسخے باہر بھیجے جاتے تھے۔
۱۴۱	مصحف عثمانیؓ۔
۱۴۳	غیر مسلموں کی شہادت۔
۱۴۴	شیعہ علماء کا بیان۔
۱۴۷	مصحفِ عثمانیؓ کے تاریخی نسخے اور ان کی داستان۔ معہ اضافہ۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

تعارف

طبع اوّل ۱۹۶۶ء

انسانی زندگی کی کامیابی کے لئے وحی کی راہ نمائی لاینفک ہے۔ اس کے بغیر نہ فرد کی ذات کی نشو و نما ہو سکتی ہے، نہ قومیں اطمینان و سکون کی زندگی بسر کر سکتی ہیں اور نہ ہی کاروانِ انسانیت اپنی منزلِ مقصود تک پہنچ سکتا ہے۔ اس راہ نمائی کے لئے مختلف زمانوں میں اور مختلف اقوام میں خدا کے رسولؑ آتے رہے۔ حتیٰ کہ قرآن کریم کی شہادت کے مطابق دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں رہی، جس کی طرف خدا کا رسولؑ نہ آیا ہو۔ (۱۰/۴۷) رسولوںؑ کی معرفت جو آسمانی تعلیم انسانوں تک پہنچائی جاتی، اسے خدا کی کتاب کہا جاتا۔ لہٰذا دنیا کی کوئی قوم ایسی نہیں، جس کی طرف خدا کی کتاب نہ آئی ہو۔ (۲/۲۱۳) ان میں سے بعض رسولوںؑ اور کتابوں کے نام قرآنِ کریم میں صراحت سے بیان ہوئے ہیں اور باقیوں کا ذکر نام لے کر نہیں آیا۔ لیکن ان رسولوںؑ یا ان کی کتابوں کا نام قرآنِ کریم میں آیا ہو، یا نہ آیا ہو (۴/۷۸) ایک مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس حقیقت پر ایمان لائے کہ یہ تمام انبیائے کرامؑ خدا کے سچے رسولؑ تھے اور جو تعلیم انہوں نے پیش کی، وہ خدا کی طرف سے تھی ـــــــ اس ایمان کے بغیر کوئی شخص مسلمان ہو نہیں سکتا۔

۲۔ قرآنِ کریم ہمیں یہ بھی بتاتا ہے کہ جب کوئی رسولؑ اپنی قوم کی طرف خدا کا پیغام پہنچا کر چلا جاتا، تو اس کے بعد اس کے متبعین، اس کی کتاب میں بگاڑ پیدا کرنا شروع کر دیتے۔ کہیں اس میں اپنی طرف سے ردّ و بدل کر دیتے، کہیں اس میں سے کچھ حذف کر دیتے، کہیں اضافہ کر دیتے اور اس طرح رفتہ رفتہ، خدا کی وہ کتاب، انسانی آمیزشوں کا مجموعہ بن کر رہ جاتی۔ بعض اوقات یہ بھی ہوتا کہ کوئی ارضی یا سماوی حادثہ اس کتاب کو یکسر ضائع ہی کر دیتا اور اس کی جگہ انسانوں کی خود ساختہ کوئی اور کتاب لے لیتی، جسے وہ قوم، آسمانی کتاب کہہ کر پکارتی۔

۳۔ قرآنِ کریم کا دعویٰ ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت خدا کی سچی تعلیم، جو مختلف اقوام کی طرف مختلف زمانوں میں آتی رہی۔ اپنی حقیقی اور غیر متبدل شکل میں دنیا میں کہیں موجود نہیں تھی۔ لہٰذا خدا نے آخری مرتبہ ایک ایسا ضابطۂ تعلیم نازل کیا جس میں تمام سچائیاں بھی آ گئیں جو انبیائے سابقہؑ کی وساطت سے، مختلف زمانوں میں آتی رہی تھیں اور ان

کے علاوہ، دیگر ایسے غیر متبدّل اصول و قوانین بھی اس میں شامل کر دیے گئے، جنہیں ہمیشہ کے لئے انسانی زندگی کا ضابطہ قرار دینا مقصود تھا۔ اس کتاب کو ہر طرح سے مکمل کر دیا اور اس کی حفاظت کا ذمّہ خود اللہ تعالیٰ نے لے لیا۔ اس کے بعد تمام اقوامِ عالم سے کہہ دیا کہ اب خدا کی سچّی، آخری اور مکمل تعلیم صرف اس کتاب (قرآنِ کریم) میں ہے اس کے باہر کہیں نہیں۔ لہٰذا جو شخص یا قوم، خدائی راہ نمائی کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتی ہے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآنِ کریم کے منجانب اللہ ہونے پر ایمان لائے اور اس کی تعلیم کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اس کے سوا، انسانیت کی نجات و سعادت کے لئے کوئی اور راستہ نہیں۔ یہ کتاب اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ مختلف اقوامِ عالم کو اپنے اپنے وقت میں خدا کی راہ نمائی ملی تھی، لیکن اب وہ راہ نمائی صرف اس کتاب کے اندر ہے ___ اس لئے یہ، خدا کی طرف سے واحد، آخری اور مکمل ضابطہ حیات ہے، جو تمام انسانوں کے لئے مشعلِ راہ ہے۔

۴۔ قرآنِ کریم کا یہ دعویٰ بہت بڑا ہے کہ دنیا کی کسی قوم کے پاس وہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرّف شکل میں موجود نہیں جو اس کے رسول کو خدا کی طرف سے ملی تھی، اور جس کتاب کو وہ اب آسمانی کہہ کر پکارتی ہے وہ انسانی آمیزشوں کا مجموعہ ہے۔ اس دعویٰ کو سچّا ثابت کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ان کتابوں کے متعلق مؤرخانہ تحقیق کے بعد یہ دکھایا جائے کہ ان کی صحیح پوزیشن کیا ہے اور جو تعلیم ان کے اندر اس وقت موجود ہے وہ کس قسم کی ہے۔ اس مقصد کے لئے میں نے اپنی کتاب معراجِ انسانیت، (یعنی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ طیّبہ) کے شروع میں، دنیا کی مشہور مذہبی کتابوں کا پورا پورا جائزہ لے کر دکھایا تھا کہ حضورؐ کی بعثت کے وقت، صحیح آسمانی تعلیم دنیا میں کہیں موجود نہیں تھی۔ وہ کتاب کچھ عرصہ سے نایاب ہو چکی ہے ___ (اس کا نیا ایڈیشن الگ شائع کیا جائے گا[1]) اس دوران میں اکثر احباب نے یہ تجویز پیش کی کہ اس کتاب کا وہ حصّہ، جس میں مبیّنہ آسمانی کتابوں کی تاریخ بیان ہوئی ہے، ایسا اہم ہے کہ اسے الگ کتابی شکل میں شائع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس تجویز کی اہمیّت کے پیشِ نظر، اس حصّے کو الگ کر لیا گیا ہے اور وہ اب بعد نظرِ ثانی، آئندہ صفحات میں آپ کے سامنے آئے گا۔

۵۔ اس ضمن میں ایک اہم نکتہ کی طرف توجہ مبذول کرانا ضروری ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان کتابوں کی تاریخ اور تعلیم کے سلسلہ میں کوئی ایسی بات سامنے نہ آئے جو اہل مذاہب کے لئے دل آزاری کا موجب ہو ___ مسلمان کسی کی دل آزاری کر ہی نہیں سکتا۔ لیکن اس کے باوجود بعض ایسے مقامات بھی آئیں گے۔ جہاں ان کتابوں کے اقتباسات دیے بغیر چارہ ہی نہیں تھا،

---

[1] اس کا نیا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے۔ (ناشر۔ ۱۹۷۷ء)

اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔ اس قسم کی باتوں کے متعلق ہمارا ایمان یہ ہے کہ وہ ان واجب الاحترام ہستیوں کی ہو نہیں سکتیں جن کی طرف انہیں منسوب کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ شروع میں کہا جا چکا ہے، ایک مسلمان اس بات پر مکلف ہے کہ وہ ایمان لائے کہ :

۱۔ دنیا کی ہر قوم میں خدا کے رسولؑ آئے۔

۲۔ ان رسولوںؑ کی رسالت کے بارے میں ہم کسی میں کوئی فرق نہیں کرتے۔ یہ سب حضراتؑ ہمارے لئے یکساں طور پر واجب الاحترام ہیں۔

۳۔ ہمارا اس پر بھی ایمان ہے کہ ان حضرات انبیاء کرامؑ کی طرف، خدا کی طرف سے سچی تعلیم آئی تھی۔ لہٰذا وہ سچی تعلیم بھی ہمارے نزدیک واجب الاحترام ہے۔

۴۔ انہی حضرات (انبیاء کرامؑ) کی عزت اور احترام کا تقاضا ہے کہ ہم اس بات کا اعلان کریں کہ کوئی ایسی تعلیم، جو علم و صداقت کے معیار پر پوری نہ اترے، ان حضراتؑ کی تعلیم نہیں ہو سکتی۔ وہ ان کی طرف غلط منسوب کی جاتی ہے۔

لہٰذا جب ان کتابوں کے اس قسم کے اقتباسات آپ کے سامنے آئیں تو اس وقت یہ حقیقت پیشِ نظر رہنی چاہیئے کہ ان سے کسی کی تنقیص و تحقیر قطعاً مقصود نہیں۔ یہ ایک مؤرخانہ معروضی مطالعہ (OBJECTIVE STUDY) ہے۔ جہاں تک احترام کا تعلق ہے، ہمارے دل میں ان بزرگوں کا احترام ان لوگوں سے بھی زیادہ ہے، جو انہیں اپنا بانیٔ مذہب مانتے ہیں۔

جہاں تک ان کتابوں کی تاریخی سرگزشت کا تعلق ہے، میں نے کوشش کی ہے کہ اس کی بنیاد اُن اربابِ علم و فکر کی تحقیق پر رکھی جائے جو خود اس مذہب سے متعلق ہیں تاکہ اس میں جانب دارانہ پہلو آنے نہ پائے۔ اُمید ہے کہ آپ اس تحقیق کو مفید پائیں گے۔ اس میں اگر آپ کو کہیں کوئی غلطی یا سہو نظر آئے، تو میں شکر گزار ہوں گا، اگر آپ مجھے اس سے مطلع فرمائیں۔

والسلام

پرویز

مقدّمہ طبع ثانی

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا جو جلدی ختم ہوگیا۔ اس کے بعد اس کی فرمائشیں مسلسل موصول ہوتی رہیں لیکن دیگر اہم تصنیفات کی اشاعت میں مصروفیت کی وجہ سے اس کے دوسرے ایڈیشن کی باری اس سے پہلے نہ آسکی۔ اب اسے لفظی تغیرات لیکن چند ایک ضروری اضافوں کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ کتاب کی اہمیت اس کے مطالعہ سے واضح ہو جائے گی۔

نومبر ۱۹۷۷ء

ناظم ادارہ طلوعِ اسلام
گلبرگ۔ لاہور

نام کتاب ——— مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں
مصنّف ——— علامہ غلام احمد پرویز
ناشر ——— طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، ۲۵/بی، گلبرگ ۲۔ لاہور ۵۴۶۶۰
طابع ——— خالد منصور نسیم
مطبع ——— النّور پرنٹرز و پبلشرز ۳/۲ فیصل نگر، ملتان روڈ۔ لاہور ——— ۵۴۵۰۰
ایڈیشن ——— پہلا، ۱۹۶۶ء
دوسرا، ۱۹۷۷ء
تیسرا، ۱۹۸۹ء (بلا ترمیم)
چوتھا، ۱۹۹۴ء (بلا ترمیم)
پانچواں، ۱۹۹۶ء (بلا ترمیم)
ضخامت ———
قیمت ———

باب اوّل

یہودیت

عیسائی جس کتاب کو بائبل کہہ کر پکارتے ہیں۔ وہ عہدنامۂ عتیق (OLD TESTAMENT) اور عہدنامۂ جدید (NEW TESTAMENT) کا مجموعہ ہے۔ عہدنامۂ عتیق کو عام طور پر توراۃ کہہ دیا جاتا ہے۔ توراۃ حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب ہے لیکن درحقیقت اس کتاب میں بنی اسرائیل کے مختلف انبیائے کرامؑ کی طرف منسوب کردہ کتابیں شامل ہیں۔ اس مجموعہ میں (۳۹) کتابیں ہیں۔ جنہیں علمائے یہود ذیل کے تین سلسلوں میں تقسیم کرتے ہیں:-

تورات

(۱) سلسلۂ اوّل تورات (یا قانون) اس میں پانچ کتابیں (اسفار) شامل ہیں۔ جنہیں کتبِ موسیٰؑ کہا جاتا ہے۔ پیدائش، خروج، احبار، گنتی، استثناء۔

(۲) سلسلۂ دوم۔ نبیئم۔ اس میں بڑی چھوٹی بائیس (۲۲) کتابیں شامل ہیں۔

(۳) سلسلۂ سوم۔ کتبیم۔ اس میں بارہ کتابیں شامل ہیں۔ (زبور اسی سلسلہ کی کتاب ہے)

یہ کتابیں (جیسی کچھ بھی ہیں) آج موجود ہیں لیکن ان میں بعض ایسی کتابوں کا حوالہ آتا ہے، جن کا وجود اس مجموعہ میں کہیں نہیں ملتا۔ اس قسم کی کم ازکم گیارہ کتابیں گنائی جا سکتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ عہدنامۂ عتیق کا جو مجموعۂ کتب اس وقت دنیا میں موجود ہے، اس کی اپنی شہادت کی بناء پر بھی یہ مکمل نہیں ہے۔

اس سے آگے بڑھئے۔ سلسلۂ اوّل کی پانچ کتابوں کو حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن ان میں حضرت موسیٰؑ کی وفات اور وفات کے بعد کے حالات بھی موجود ہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان پانچ کتابوں کا کم ازکم کچھ حصّہ یقینی طور پر بعد کا اضافہ ہے۔ عہدنامۂ عتیق کی کتابوں کے متعلق اس وقت تک بہ تحقیق ثابت نہیں ہو سکا کہ ابتداءً یہ کس عہد میں مدوّن ہوئیں اور ان کے مؤلف کون تھے۔ البتہ اتنا ضرور متحقق ہے کہ ایک زمانہ ایسا آیا، جس میں ان کا وجود ناپید ہو چکا تھا اور اس کے بعد از سرِ نو ان کی تدوین عمل میں آئی تھی۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت سلیمانؑ کے بعد بنی اسرائیل باہمی تشتّت و افتراق کے عذاب میں گرفتار ہوئے اور ان کی

بنی اسرائیل کا دورِ انتشار

دو مختلف سلطنتیں، ایک دوسرے کے مقابل رقیبانہ حیثیت سے قائم ہو گئیں یعنی دس اسباطِ بنی اسرائیل پر مشتمل ایک سلطنت (جس کا دار الحکومت سماریہ تھا) اور دو اسباط (یہودا اور بن یامین) پر مشتمل دوسری سلطنت (جس کا مرکز یروشلم تھا) آٹھویں صدی قبل مسیح میں، سیریا والوں نے سماریہ کی سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا اور بنی اسرائیل کو گرفتار کر کے نینوا لے گئے۔ قومیں اپنی مرکزیت کھو کر کس طرح ریت کے ذرّوں کی طرح اُڑتی پھرتی ہیں اور پھر رفتہ رفتہ ان کا نام و نشان تک صفحۂ ہستی سے مٹ جاتا ہے، اس کی عبرت انگیز شہادت ان دس اسباط پر مشتمل قومِ بنی اسرائیل کا انجام ہے۔ آج محققین کی بڑی سے بڑی خوردبین بھی یہ نہیں بتا سکتی کہ یہ دس اسباط بالآخر کہاں گم ہو گئے۔ اِدھر اُدھر سے قیاسی سراغ نکالے جاتے ہیں۔ کچھ حصّہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آج افغانستان اور سرحد کے پٹھانوں کی صورت میں متشکل ہے اور ایک حصّہ کے متعلق قیاس ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندوؤں کے پیکر میں متحرک ہے۔ (تفصیل اس کی ہندومت کے عنوان میں ملے گی) بہرحال یہ محض قیاسات ہیں۔ یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ اپنی مرکزیت کھو کر یہ عظیم الشّان قوم کن کن صحراؤں میں جذب اور کون کون سے بیابانوں میں فنا ہو گئی۔ ہر قوم جو اپنی ملی مرکزیت کی حفاظت نہیں کرتی، اس کا یہی انجام ہوتا ہے۔ وہ دوسروں میں اس طرح مدغم ہو جاتی ہے کہ بعد میں ان کی جداگانہ ہستی کا سراغ تک نہیں ملتا۔ بہرحال، یہ تھا انجام بنی اسرائیل کے ایک حصّہ کا۔ اب دوسرے حصّہ کو لیجئے۔ چھٹی صدی قبل مسیح میں بابل کے شہنشاہ بخت نصر نے یروشلم پر حملہ کیا اور اسے تاخت و تاراج کرنے کے بعد یہودیوں کو گرفتار کر کے اپنے ساتھ (بابل) لے گیا۔ حضرت سلیمانؑ نے الواحِ تورات اور دیگر تبرّکات کو بیت المقدس کے ہیکل میں

کتبِ مقدسہ تباہ ہو گئیں

میں محفوظ رکھا تھا۔ بخت نصر نے ان سب کو جلا کر راکھ کا ڈھیر کر دیا[1] اور باقی سب کچھ اپنے ساتھ لے گیا۔ تورات میں ہے:-

---

[1]: تورات سے تو بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ الواحِ تورات حضرت سلیمانؑ کے زمانہ سے بھی پہلے ضائع ہو چکی تھیں کیونکہ ہیکل کی تکمیل کے بعد جب اس صندوق کو وہاں منتقل کیا گیا ہے، جس میں تورات کی تختیاں رکھی تھیں، تو اس میں سے صرف دو تختیاں برآمد ہوئیں۔ اب ظاہر ہے کہ ان دو تختیوں پر موجودہ تورات کی پانچ کتابیں (جنہیں کُتبِ موسیٰؑ کہا جاتا ہے) کسی طرح بھی نہیں لکھی جا سکتی تھیں، چہ جائیکہ حضرت موسیٰؑ سے لے کر حضرت سلیمانؑ تک کے انبیائےؑ بنی اسرائیل کے تمام صحیفے ان دو تختیوں پر لکھے جاتے۔ تورات میں ہے کہ ہیکل کی تعمیر ہو چکی تو:-

کاہنوں نے خداوند کے عہد کے صندوق کو اس کی جگہ پر گھر کی الہام گاہ میں یعنی پاک ترین مکان میں لا کر اسے

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحے پر دیکھئے)

تب یسعیاہ نے حزقیاہ سے کہا خداوند کا کلام سن۔ دیکھ وہ دن آتے ہیں کہ سب جو کچھ تیرے گھر میں ہے اور جو کچھ کہ تیرے باپ دادوں نے آج کے دن تک جمع کر رکھا ہے، سب بابل کو لے جائیں گے۔ کچھ باقی نہ رہے گا۔ (سلاطین ۲ ۱۶-۱۷/۲۰)

یہ تھا وہ زمانہ جب ان کتب مقدسہ کا وجود دنیا سے ناپید ہو گیا۔ اس لئے کہ یہ کتابیں یروشلم کے ہیکل میں تھیں اور ہیکل کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ پچاس برس کی قید و بند کے مصائب اور غلامی و محکومی کے جانگسل نوائب کے بعد عزرا اور نحمیاہ ۱ نبی کی کوششوں سے بیت المقدس کی دوبارہ تعمیر کی اجازت ملی۔ خدا خدا کر کے بنی اسرائیل کے بقیۃ السیف پھر اس ارضِ مقدس کی طرف لوٹے، جسے ان کے اعمال کی بدبختیوں نے ان سے یوں چھین لیا تھا۔ سپنگلر کی تحقیق کے مطابق ان واپس آنے والوں کی مجموعی تعداد چالیس ہزار سے زیادہ نہ تھی جو یہود کی کل آبادی کا بیسواں حصہ بھی نہ تھا۔

(DECLINE OF THE WEST II. P. 208)

تورات کی ازسرِنو ترتیب

اب جو ذرا سکون نصیب ہوا تو سب سے پہلے اپنے گم گشتہ صحفِ مقدسہ کی ترتیبِ نو کی فکر ہوئی۔ عزرا نبی نے تورات (یعنی سلسلہ اوّل کی پانچ کتابوں) کو ازسرِنو مرتب کر کے واقعات کو مؤرخانہ حیثیت سے قلمبند کیا۔ (اس کی تفصیل تورات، کتاب نحمیاہ باب ۸ میں موجود ہے۔ عزرا نے ان کتابوں کو کس مواد (MATERIAL) سے ازسرِنو مرتب کیا تھا، تاریخ اس پر کچھ روشنی نہیں ڈالتی۔ جو کچھ زیادہ سے زیادہ کہا جا سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے علماء نے یہ طریقہ اختیار

---

۱ یہودی لٹریچر میں نبی کا لفظ قرآنی اصطلاح کے مفہوم میں استعمال نہیں ہوا۔ اس سے ہیکل کا ایک اعلیٰ منصب دار مراد تھا۔ تورات میں عزرا کو فقیہہ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ (دیکھئے کتاب نحمیاہ ۱/۸)

(بقیہ فٹ نوٹ صـ سے آگے) کروبیوں کے پروں کے نیچے رکھا یعنی کروبی اپنے دو بازو صندوق کی جگہ کے اوپر پھیلائے ہوئے تھے اور کروبیوں نے صندوق کو اور اس کی چوبوں کو چھپا رکھا۔ سو چوبیں ادھر بڑھ آئیں۔ ایسی کہ چوبوں کے سرے پاک مکان سے الہام گاہ کے سامنے دکھائی دیتے تھے۔ اور وہ وہاں آج کے دن تک ہیں اور صندوق میں کچھ نہیں تھا سوائے پتھر کی ان دو لوحوں کے جنہیں موسیٰ علیہ السلام نے حورب پر اس میں رکھا۔ جب کہ خداوند نے بنی اسرائیل سے ان کے زمین مصر سے نکلتے وقت عہد باندھا تھا۔ (سلاطین (۱) ۶-۹/۸)

کر رکھا تھا کہ سبت کے دن لوگوں کو جمع کر کے انہیں روایات بالمعنیٰ کے طریق پر، تورات کا وعظ سناتے۔ (یعنی تورات کے الفاظ نہیں بلکہ اس کا مفہوم۔ اسی کو روایات بالمعنیٰ کہتے ہیں) جنہیں تورات کی کچھ آیات یاد ہوتیں، وہ پہلے ان آیات کو پڑھتے (جو قدیم عبرانی زبان میں تھی) اور پھر اس کی تفسیر ارامی زبان میں بیان کرتے، جو بابل کے اثر سے یہود کی زبان ہو گئی تھی[1]۔ یہ سلسلہ بیت المقدس کی واپسی پر بھی جاری رہا۔ غالباً یہی وہ روایات تھیں (یعنی تورات کا جو مفہوم علمائے یہود بتاتے تھے) جو عزرا نبی کی مرتب کردہ پانچ کتابوں کا ماخذ تھا۔

لیکن مشکل یہ ہے کہ خود عزرا کے متعلق بھی یقینی طور پر معلوم نہیں کہ وہ کب یروشلم میں آئے۔ عام یہود کے خیال کے مطابق، وہ بابل کی اسیری کے زمانہ میں بھی ان کے ساتھ تھے اور پھر ان کے ساتھ ہی یروشلم واپس لوٹے۔ یہودیوں کی اسیری کا زمانہ ۵۱۵ سنہ قم میں ختم ہو چکا تھا لیکن تاریخ کی شہادت ہے کہ عزرا (فقیہہ) کو شاہ ارتخششتا (ARTAXEAXES) نے ۴۴۵ سنہ قم یا زیادہ سے زیادہ ۴۵۷ سنہ قم میں بابل سے یروشلم بھیجا تھا۔ یعنی یہودیوں کے زمانہ اسیری کے اختتام کے بہت عرصہ بعد۔

---

[1] غور کیجئے کہ محکومی کا اثر کس قدر برق رفتار اور جز رس ہوتا ہے۔ اتنے سے عرصہ میں یہود اپنی آبائی زبان کھو بیٹھے۔ یروشلم کی تباہی کے سلسلہ میں یہودیوں کی سلطنت چھنی۔ دولت لٹی۔ ثروت گئی۔ یہ سب کچھ ہوا لیکن ان سب سے کہیں بڑھ کر جو نقصان ہوا وہ یہ تھا کہ اس محکومی سے وہ اپنی تہذیب و تمدن اور اپنی آبائی زبان تک سے محروم ہو گئے۔ بیت المقدس دوبارہ تعمیر ہو گیا۔ بنی اسرائیل اس میں پھر آ کر بس گئے۔ یہ سب کچھ واپس مل گیا لیکن اپنی زبان چھن جانے سے جو نقصان پہنچا، اس کی تلافی آج تک نہ ہو سکی۔ قوموں کے ملی وجود کے تحفظ کے لئے ان کی زبان کا تحفظ نہایت ضروری ہے۔ زبان مٹ جانے سے قومی تشخص مٹ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں کی اسیری کے زمانہ میں (اور اس کے بعد بھی) ان کے ارباب بصیرت اپنا سر پیٹتے تھے کہ یہ خارجی اثرات، جنہیں یہودی یوں قبول کئے جا رہے ہیں، ان کی ابدی تباہی کا موجب بن جائیں گے۔ نحمیاہ نبی کی کتاب میں ہے:۔

> انہی دنوں میں میں نے چند یہودیوں کو بھی دیکھا جو اشدودی، عمونی اور موآبی عورتوں کو بیاہ لائے تھے اور ان کے لڑکے آدھی اشدودی زبان بولتے تھے اور یہودی زبان نہ بول سکتے تھے بلکہ ملی جلی بولتے تھے۔ تب میں نے ان سے جھگڑا کیا اور انہیں ملامت کی اور ان میں سے کتنوں کو مارا اور ان کے بال اکھیڑے اور ان سے یوں خدا کی قسم لی کہ ہم اپنی بیٹیاں ان کے بیٹوں کو نہ دیں گے اور ان کی بیٹیاں اپنے بیٹوں کے لئے اور نہ اپنے لئے لیں گے۔ (۲۵–۲۴/۱۳)

تورات کیسے مرتب ہوئی

لیکن وہ یروشلم میں ۴۴۵ ق م میں آئے ہوں یا ۴۵۷ ق م میں یہ متحقق ہے کہ انہوں نے اسفارِ موسیٰؑ کی تدوین ۴۴۴-۴۴۵ ق م میں کی تھی[1]۔ یہ تدوین کس طرح عمل میں آئی تھی؟ اس کے متعلق مختلف بیانات ہیں۔ ایک بیان یہ ہے:

معلوم ہوتا ہے کہ عزرا نے زمانۂ اسیری میں صحفِ مقدسہ کا خصوصیت سے مطالعہ کیا اور نحمیاہ نبی اور کنیسہ عظمیٰ کے دیگر اراکین کی مدد سے ان غلطیوں کو درست کیا جو کاتبوں کے سہو یا تغافل سے ان مقدس نوشتوں میں داخل ہو چکی تھیں۔ اس نے ان تمام کتابوں کو اکٹھا کیا، جو اس زمانہ میں مقدس مانی جاتی تھیں۔ انہیں ترتیب دیا اور اپنے عہد کے لئے بائبل کا قانون مدوّن کیا۔ اس نے مقدس روح کی مدد سے ان میں ان چیزوں کا اضافہ بھی کیا جو توضیحِ مطالب یا ترتیب و تکملہ کے لئے ضروری سمجھی گئیں۔ اگرچہ وہ خود نبی نہ تھا، لیکن اس نے یہ سب کچھ روح القدس کے تحت لکھا اور اس کی کتاب کی شرعی حیثیت کبھی محلِّ نظر نہیں ٹھہری۔ (INTRODUCTION TO POLYGLOT BIBLE) لیکن کیٹو (KITTO) اپنے سائیکلوپیڈیا آف ببلیکل لٹریچر میں لکھتا ہے:

"یہاں تک کہا جاتا ہے کہ عزرا نے تمام عہدِ عتیق کو محض حافظہ کی مدد سے ازسرِ نو تحریر کیا کیونکہ ان کتابوں کے تمام نسخے تغافل شعاری کی وجہ سے معدوم ہو چکے تھے۔"

غور کیجئے کہ ان ہر دو تاریخی بیانات میں کس قدر فرق ہے۔ پہلے بیان میں یہ کہا گیا ہے کہ عزرا نے ان پراگندہ نوشتوں کو صرف ازسرِ نو ترتیب دیا۔ اگرچہ اس میں اپنی طرف سے بھی اضافے کئے لیکن کیٹو کی تحقیق کے مطابق، عزرا (فقیہہ) نے تمام کتابوں کو حافظہ کی مدد سے ازسرِ نو لکھا کیونکہ ان کے تمام نسخے ضائع ہو چکے تھے۔ دوسرا بیان زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کیونکہ وہ تورات کے بیان کے مطابق ہے۔ جس میں (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) بصراحت مذکور ہے کہ بخت نصر کے حملہ کے وقت یروشلم میں جو کچھ تھا، سب تباہ اور برباد ہو چکا تھا۔

عزرا کا بیان

لیکن دیکھئے کہ عزرا (فقیہہ) اس جمع و تدوین کے متعلق کیا لکھتے ہیں۔ انہوں نے اسفارِ موسیٰؑ وغیرہ کے علاوہ اور کتابیں بھی لکھی ہیں۔ جن میں دو کتابیں (عزرا اول و دوم) خود اپنے متعلق ہیں۔ کتاب[2] دوم باب ۱۴ آیات ۲۲-۲۰ میں مذکور ہے:-

---

[1] CHRONOLOGICAL INDEX TO THE HOLY BIBLE.

[2] بائبل کے لاطینی نسخہ میں عزرا کی کتاب دوم موجود ہے۔ جسے انگریزی اور اردو ترجموں میں منتقل نہیں کیا گیا۔

"اے خداوند! دنیا میں اندھیرا چھا رہا ہے اور جو لوگ اس میں بستے ہیں، سب بغیر روشنی کے ہیں کیونکہ تیری ہدایت (قانون) جل چکا ہے۔ اس لئے کوئی شخص نہ ان معاملات کا علم رکھتا ہے جو گذر چکے ہیں۔ اور نہ ان کا جو شروع ہونے والے ہیں لیکن میں نے تیرے حضور عزت پائی ہے، (اس لئے اے خداوند خدا) روح القدس کو مجھ میں داخل کر دے اور میں پھر وہ سب کچھ لکھوں جو دنیا میں ہو چکا ہے[1]۔ اور جو تیرے قانون کی کتابوں میں لکھا ہوا تھا تاکہ لوگ تیرا راستہ پالیں اور تاکہ آنے والے بھی صحیح زندگی بسر کر سکیں"

یہ تھی عزرا فقیہہ کی دعا۔ اس کے بعد وہ لکھتے ہیں:-

"دوسرے روز ایک آواز نے مجھے بلایا اور کہا۔ عزرا! اپنا منہ کھولو! اور وہ کچھ پیو، جسے میں تمھیں پینے کے لئے دیتا ہوں۔ سو میں نے اپنا منہ کھول دیا۔ تب دیکھو اس نے مجھ تک ایک پیالہ بھیجا۔ وہ پانی سے بھرا ہوا معلوم ہوتا تھا لیکن اس کا رنگ آتشیں تھا۔ میں نے اسے لیا اور پی گیا۔ جب میں نے اسے پی لیا، تو میرے دل میں فہم و فراست اور سینے میں بصیرت پیدا ہو گئی اور میری روح نے میرے حافظہ کو قوی بنا دیا اور پھر جو میری زبان کھلی ہے تو بند نہیں ہوئی اور لکھنے والے چالیس دن تک بیٹھے لکھتے رہے۔ وہ دن بھر لکھتے تھے اور صرف رات کے وقت کچھ کھاتے۔ میں دن بھر لکھاتا رہتا تھا اور رات کو بھی میری زبان بند نہ ہوتی ــــ چالیس دنوں میں انہوں نے ۲۰۴ کتابیں لکھ ڈالیں۔

(کتاب ۲ عزرا ۴۴-۳۸/۱۴)

یہ بیان کسی وضاحت کا محتاج نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان کتابوں کو عزرا (فقیہہ) نے اپنے حافظہ کی مدد سے لکھوایا اور اس وقت تمام اصلی کتابیں ناپید تھیں۔ یہاں اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سامنے لے آئیے کہ یروشلم کی تباہی ۵۸۶ سنہ قم کے قریب ہوئی اور عزرا (فقیہہ) نے ان کتابوں کو ۴۴۴ سنہ قم میں لکھا یعنی قریب ڈیڑھ سو سال بعد۔ اس سے یہ واضح ہے کہ خود عزرا (فقیہہ) نے بھی ان کتابوں کو کہیں نہیں دیکھا تھا، جہاں سے انہیں حفظ اور یاد کر لیا ہوتا اور پھر اپنے حافظہ کی مدد سے دوبارہ لکھوا دیا ہوتا۔ لہذا ان کتابوں کے مصنف خود عزرا فقیہہ ہیں۔ (جس انداز سے عزرا (فقیہہ) نے، اپنے بیان کے مطابق، ان کتابوں کو تصنیف کیا ہے، بعینہٖ یہی انداز مذہبِ زرتشت کی گم گشتہ "آسمانی کتابوں" کی از سرِ نو

---

[1] یاد رہے کہ اسفارِ موسیٰ میں سب سے پہلی کتاب "پیدائش" میں دنیا کی ابتداء سے واقعات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔

تصنیف کے بارے میں مذکور ہے۔ تفصیل اس کی "زرتشت" کے عنوان میں آئے گی) تاریخ کی تحقیق جدید یہ بھی ہے کہ کہ عزرا (فقیہہ) زرتشتی تعلیم سے متاثر تھے۔[1] اس لئے انہوں نے اسی انداز سے، جس میں زرتشتی کتابوں کی بازیافت کا قصہ مشہور تھا، عہدِ عتیق کی کتابیں یہودیوں کو تصنیف کر کے دے دیں۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ خود عزرا (فقیہہ) کے بیان کے مطابق۔ انہوں نے ۲۰۴ کتابیں لکھوائی تھیں لیکن اب کہا یہ جاتا ہے کہ انہوں نے صرف اسفارِ موسیٰؑ (یعنی تورات کی پہلی پانچ کتابیں) مرتب کی تھیں۔ ان (۲۰۴) کتابوں کے متعلق ذرا آگے چل کر ذکر آتا ہے۔

بہرحال یہ ہے تاریخِ تصنیف و ترتیب ان اسفارِ موسیٰؑ (یعنی تورات کی بنیادی کتابوں) کی جو مذہب یہودیت کا عروۃ الوثقیٰ ہیں۔

عزرا (فقیہہ) کے بعد نحمیاہ نبی نے، نبیم۔ یعنی سلسلۂ دوم کی کتابوں کو جمع کیا (مقابان نمبر ۲: ۲/۱۳) لیکن اس کے بعد فلسطین کی طرف یونانیوں کا سیلاب امنڈا، اور ۱۶۸ ق م میں انٹونیس (انطاکیہ کے یونانی بادشاہ) نے پھر بیت المقدس کو برباد کیا۔ مقدس صحیفوں کو جلوایا اور تورات کی تلاوت کو حکماً بند کر دیا۔ اس کے بعد یہودا مقابی کی ہمت سے بیت المقدس کی بازیابی ہوئی۔ مقدس صحیفوں کو از سرِ نو جمع کیا گیا اور اس مرتبہ، پہلے دو سلسلوں کے ساتھ، سلسلۂ سوم، یعنی کتبیم کی کتابوں کا بھی اضافہ ہو گیا۔ پھر رومیوں کا طوفان اٹھا اور ٹائٹس

دوبارہ بربادی

نے ۷۰ء میں بیت المقدس کو اس طرح برباد کیا کہ پھر یہودی اس میں آکر آباد نہ ہو سکے۔ ان کی مرکزیت فنا ہو گئی۔ ان کا شیرازہ بکھر گیا۔ ٹائٹس مقدس صحیفوں کو ہیکل سے نکال کر، فتح کی یادگار کے طور پر، روما کے محلات میں لے گیا۔ یہ بنی اسرائیل کی آخری تباہی تھی۔ اس کے بعد یہودیوں کی آبادیوں میں ان کے علماء نے انفرادی طور پر تورات کے وعظوں کا سلسلہ جاری کیا (جس طرح بابل کی اسیری کے زمانہ میں کرتے تھے) اور اپنے اپنے طور پر (جو کچھ جسے یاد

---

[1] یہاں یہ بیان کر دینا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ بخت نصر کو فارس کے زرتشتی بادشاہ سائرس نے شکست دی تھی اور اس کے بعد بنی اسرائیل کو بابلیوں کے مظالم سے چھڑا کر یروشلم میں بسنے اور ہیکل کی تعمیر کرنے کی اجازت دی تھی۔ سائرس کے بعد دارا اس کا جانشین ہوا۔ پھر ارتخششتا جس نے عزرا کو یروشلم بھیجا تھا۔ یہ سب بادشاہ مذہبِ زرتشتی کے پیرو تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ عزرا (فقیہہ) پر زرتشتی تعلیم اور معتقدات کا کس قدر اثر ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خود زرتشتی مذہب کے ہی پیرو ہوں۔ قرائن خود اسی کی تائید کرتے ہیں۔

تھا یا جیسا کچھ مفہوم ذہنوں میں مستحضر تھا) ان صحیفوں کو ترتیب دیا۔ یہ صحیفے صندوقوں میں رکھے جاتے تھے اور جب لوگ کنیسوں میں جمع ہوتے، تو انہیں ان میں سے کچھ سنا دیا جاتا تھا۔ اس مقام تک ہم اتنا دیکھ چکے ہیں کہ یروشلم کی آخری بربادی (سنہ ۷۰ء) کے زمانہ تک یہودیوں کے ہاں تینوں سلسلوں کی کتابیں مدوّن ہو چکی تھیں۔ جن کی تعداد آج (۳۹) ہے لیکن یہودیوں کا سب سے بڑا مستند مؤرخ (ANTIQUITIES OF JEWS کا مصنف (جوزیفس) ان کتابوں کی تعداد کے متعلق کچھ اور ہی لکھتا ہے۔

جوزیفس کا بیان

وہ اپنی خودنوشت سوانح حیات میں رقمطراز ہے:۔

جب میرے ملک کی تباہی ہوئی .... تو میں نے ٹائٹس سے درخواست کی کہ میرے خاندان کو آزاد کر دیا جائے۔ اس کی عنایت سے مجھے کتب مقدسہ بھی مل گئیں۔

اب ان کی تعداد کا ذکر آتا ہے:

"ہمارے ہاں کتابوں کا سلسلہ لاتعداد نہیں جو ایک دوسرے سے متخالف و متباین ہوں (جیسا کہ یونانیوں کے ہاں ہے)، ہمارے ہاں کل بائیس کتابیں ہیں، جن میں تمام ازمنۂ سابقہ کے واقعات محفوظ ہیں اور جو تمام الہامی ہیں۔ ان میں پانچ کتابیں موسیٰ کی ہیں۔ جن میں شریعت کے قوانین اور نوعِ انسانی کی ابتدا سے لے کر (حضرت) موسیٰ کی وفات تک کی تاریخی روایات ہیں۔ (حضرت) موسیٰ کے بعد کے انبیاء نے تیرہ کتابوں میں اپنے عہد کے حالات لکھے ہیں۔ باقی چار کتابوں میں حمد و ستائش کے نغمے، اور انسانی زندگی کے عام اخلاقی ضوابط درج ہیں۔"

(REPLY TO APION, BOOK 1 - SEC 8)

یعنی جوزیفس کے بیان کے مطابق ۷۰ء کے لگ بھگ یہودیوں کے ہاں صرف بائیس ۲۲ کتابیں تھیں۔ نہ کہ (۲۰۴) جیسا کہ عزرا فقیہہ نے لکھا ہے اور نہ انتالیس ۳۹ جنہیں آج مجموعۂ عہدِ عتیق کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔

پھر یہی نہیں کہ ان کتابوں کو حوادثِ ارضی و سماوی ہی تباہ کر دیتے تھے بلکہ ان میں دانستہ تحریف و الحاق کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ چنانچہ مشہور مسیحی مؤرخ رینان لکھتا ہے کہ:۔

"اسی زمانہ (یعنی زمانہ قربِ حضرت مسیحؑ) میں تورات میں بھی بہت سی اہم تبدیلیاں کی گئیں۔ (بالکل نئی کتابیں۔ مثل کتابِ استثناء مرتب کی گئیں اور کہا یہ گیا کہ یہ کتابیں (حضرت) موسیٰ کی اصل شریعت کی حامل ہیں۔ حالانکہ درحقیقت ان کی روح پرانی کتابوں سے بالکل مختلف تھی۔"

جب یہودا مقابی نے انٹونیس کی زنجیروں کو توڑ کر دوبارہ آزادی حاصل کی اور صحف مقدسہ کی ترتیب کے ساتھ سلسلۂ سوم بھی ملایا تو یہودیوں کے دو فرقے ہوگئے۔ ایک صدوقی جنہوں نے سماریہ والوں کی طرح، صرف سلسلۂ اول (یعنی موسیٰؑ کی پانچ کتابوں) پر ہی اکتفا کیا اور باقی صحف کو مذہب سے خارج کر دیا۔ دوسرے فریسی، جنہوں نے سلسلۂ دوم و سوم کی کتابوں کو بھی جزوِ دین قرار دیا۔ ان کے ہاں یہ عقیدہ رائج ہوگیا کہ در اصل حضرت موسیٰؑ کی وحی کی دو قسمیں تھیں۔ ایک تورہ شبکتب، یعنی

وحی متلو و غیر متلو

وحیٔ مکتوب اور دوسری تورۂ شبعلفہ یعنی وحیٔ غیر مکتوب۔ یہ وحیٔ غیر مکتوب حضرت ہارونؑ اور ان کی اولاد کی وساطت سے، بسلسلۂ روایات آگے بڑھا تا آنکہ یہ عزراؔ تک پہنچا۔ جس نے تورات کی کتابت کے لئے ۱۲۰ علماء پر مشتمل ایک مجلس متعین کی۔ اس طرح یہ سلسلۂ روایات ان علماء تک پہنچا اور ان سے آگے بڑھا۔ اس جماعت کا آخری رکن (شمعون) سنہ ۳۰۰ ق م میں فوت ہوگیا۔ اس سے یہ سلسلۂ سفریم (یعنی کاتبانِ وحی) تک پہنچا۔ وہاں سے تنائم (یعنی عام علماء تک) پھر ان سے احبار و ربیین نے سیکھا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس طرح اس "وحیٔ غیر مکتوب" کے سلسلۂ روایات کا کتنا بڑا طومار جمع ہوگیا ہوگا۔ ان تمام روایات کو بھی وحی سمجھا جاتا تھا۔ دوسری صدی عیسوی کے اخیر میں، ربی یہودا نے ان اقوال کو جمع کیا۔ اس مجموعہ کا نام مشنا (MISHNAH) ہے۔ پھر اس مجموعہ کی تشریحات و تفسیرات جمع کی گئیں۔ اس کا نام جمارا (GEMARA) ہے۔

تالمود

ان دونوں کے مجموعہ کو تالمود کہتے ہیں۔ یہ تالمود بھی یہودیوں کے ہاں تورات کی سی اہمیت رکھتا ہے بلکہ تورات سے بھی زیادہ کیونکہ ان کے نزدیک یہ مجموعۂ تورات کی تفسیر ہے اور وحی کا ہم پلہ۔ تالمود بھی دو ہیں۔ ایک شامی (یا فلسطینی) اور دوسرا بابلی۔ یہ دونوں پانچویں صدی عیسوی کے مرتب شدہ ہیں۔ پہلے فلسطینی اور پھر بابلی ــــ جیسا کہ روایات میں اکثر ہوتا ہے، تالمود میں عجیب و غریب افسانے، عجائبات، بے سروپا قصص و حکایات، جادو اور طلسمات کے کرشمے، گنڈے، تعویذ، جھاڑ پھونک۔ غرضیکہ دنیا بھر کے اوہام جمع ہیں۔

یہ تو تھا سلسلۂ روایات۔ اس کے علاوہ ایک اور ذخیرہ بھی تھا جو اس سے زیادہ پُرپیچ اور مخفی راستوں سے جمع کیا گیا تھا۔ عزرا (فقیہہ) کے متعلق مشہور تھا کہ جب انہوں نے تورات کی پانچ کتابوں کو مرتب کیا ہے تو اس کے ساتھ ہی ستر مخفی ملفوظات بھی مدوّن کئے تھے۔ جن کی تعلیم پوشیدہ طور پر صرف خواص تک محدود تھی۔ اس مجموعہ کو "سفریم جنوزیم" (یعنی مخفی خزانہ کی کتابیں) کہا جاتا ہے۔ یہ سلسلہ سینہ بسینہ جاری رہا۔ ظاہر ہے کہ اس سلسلہ میں بھی اختلافات کی کس قدر گنجائش اور وضع و تلبیس کی کتنی وسعت تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ کے حاملین کی ایک دوسرے سے ردّ و کد ہوتی

باطنی علم رہتی تھی۔ یہ اسے جعلی قرار دیتے۔ وہ اسے وضعی کہتے۔ نتیجہ یہ کہ آہستہ آہستہ اس مجموعہ کا نام ہی اپوکریفہ (APOCRYPHA) یعنی جعلی پڑ گیا۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے ہاں (APOCRYPHIC LITERATURE) ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔ عہدنامۂ عتیق کے سلسلہ میں قریب ۳۵ کتابیں ایسی موجود ہیں جو اس سلسلہ میں شامل ہیں۔ جیسا کہ اوپر لکھا جاچکا ہے۔ ان مخفی نوشتوں کو خود عزرا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ عزرا کا اپنا بیان ہے کہ ان ۹۴ کتابوں کے متعلق (جو انہوں نے مرتب کی تھی) اس "بلند و بالا ہستی" کا ارشاد ہوا کہ ان کے پہلے حصے کو عام طور پر شائع کردو۔

"تاکہ اہل اور نااہل سب انہیں پڑھ سکیں لیکن دوسرے حصہ کی ستر کتابوں کو مخفی رکھو اور صرف انہی کو دو جو لوگوں میں سمجھ بوجھ کے مالک ہوں کیونکہ یہی لوگ ہیں، جن میں فہم و فراست کا چشمہ، عقل کا منبع اور علم کا دریا ہے[1]" (عزرا کتاب دوم۔ ۴۶-۴۴/۱۴)

اس سے واضح ہے کہ جن کتابوں کو بعد میں اپوکریفہ کہا گیا، وہی درحقیقت دین کا مغز ہیں۔ باقی "استخوان" ہیں، جنہیں اہل و نااہل سب کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے لیکن ان اپوکریفہ کتابوں کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہئیے کہ انہیں جعلی قرار دے کر مسترد کردیا گیا ہے۔ **اپوکریفہ** عیسائیوں کے فرقہ پراٹسٹنٹ کے بانی (لوتھر) نے انہیں مسترد قرار دے دیا تھا لیکن ٹرنٹ (TRENT) کی کونسل (منعقدہ ۱۵۴۵ء) نے یہ فیصلہ دیا کہ یہ کتابیں بھی دیگر کتبِ مقدسہ کے ہم پایہ ہیں[2]۔ اس لئے رومن کیتھولک کے نزدیک، ان میں اور دیگر کتبِ مقدسہ میں کچھ فرق نہیں۔ چنانچہ ان کی شائع کردہ بائبل میں یہ مجموعہ برابر شامل ہوتا ہے اور خود پراٹسٹنٹ کے ہاں بھی ان سے مستفید ہونے میں چنداں قباحت نہیں۔ ان کتابوں کی عام اشاعت کی ممانعت کے متعلق LIBRARY OF UNIVERSAL KNOWLEDGE میں یہ الفاظ ملتے ہیں:۔

---

[1] غور فرمایا آپ نے کہ "علمِ لدنّی" کے عقیدہ اور "شریعت و طریقت" کے امتیاز کا سرچشمہ کہاں ہے؟ سپنگلر کے بیان کے مطابق اس نظریہ کی ابتدا مجوسیوں کے ہاں سے ہوئی اور اس کے بعد یہودیت، عیسائیت اور اسلام سب میں پھیل گیا۔
(SPENGLER — "DECLINE OF THE WEST" VOL. II. P. 247)

[2] حالانکہ (COUNCIL OF LAODICEA) منعقدہ ۳۶۰ء میں یہ فیصلہ کیا گیا تھا کہ اپوکریفہ کتابوں کو شریعت کا قانون نہ سمجھا جائے۔

"اپوکریفہ بعض اوقات ان تحریروں کو بھی کہا جاتا تھا، جن کی عام اشاعت مناسب نہیں سمجھی جاتی تھی۔ یوں سمجھئے کہ جنہیں خدا نے انبیاء کو بذریعہ وحی دیا لیکن بعد میں علماء نے سوچا کہ خدا کا یہ فیصلہ (معاذ اللہ) درست نہیں۔ لہٰذا اس وحی کو دبا لینا ہی بہتر ہے۔"

لیکن اپوکریفہ کے متعلق رینانؔ کی رائے بھی قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"دیانتداری اور جعل سازی، دو ایسے الفاظ ہیں جو ہمارے ضمیر کے مطابق یکسر متضاد ہیں اور ان میں کسی صورت میں توافق پیدا نہیں کیا جا سکتا لیکن مشرق میں ان میں بے شمار لطیف روابط کے ذریعے تطابق پیدا کر لیا جاتا ہے۔ کتب اپوکریفہ (مثل کتاب دانیال اور انوخ) کے مصنف بڑی عزّت و تکریم کے حامل تصور کئے جاتے ہیں، جنہوں نے اپنے مشن کی سرفرازی کے لئے، بلا تأمل و تردّد ایسے کام کئے، جنہیں ہم آج سراسر فریب کہہ سکتے ہیں۔ (حقیقت یہ ہے کہ) ایک مشرقی کے نزدیک خالص صداقت کی کچھ قیمت نہیں۔ وہ ہر شے کو اپنے خیالات، اپنے مفاد اور اپنے جذبات کے آئینہ میں دیکھتا ہے۔"[1]

تورات کی زبان

یہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ یہودیوں کی اپنی زبان قدیم عبرانی تھی لیکن بابل سے مراجعت کے بعد ان کی زبان ارامی ہو گئی۔ عزراؔ نے عہدِ عتیق کی کتابوں کو کس زبان میں لکھا تھا، یہ بالتحقیق معلوم نہیں۔ اس لئے کہ ان کی مرتّب کردہ کتابوں کا بھی دنیا میں کہیں موجود نہیں لیکن یہ تو ظاہر ہے کہ انہوں نے ان کتابوں کو یا تو یہودیوں کی اصل زبان (عبرانی قدیم) میں لکھا ہوگا، یا پھر بعد کی زبان (ارامی) میں لیکن دنیا جن کتابوں سے روشناس ہوئی وہ سب کی سب یونانی زبان میں تھیں۔ جس طرح یہودیوں نے بابل کی اسیری کے زمانہ میں اپنی اصلی زبان بھلا دی تھی، اسی طرح یونانیوں کے زیرِ اثر اسکندریہ میں بھی انہوں نے اپنی مادری زبان بھلا دی اور ان کی زبان یونانی ہی ہو گئی۔ اس لئے تاریخ کا بیان ہے کہ قریب ۲۸۵ ق م میں اسفارِ موسیٰؑ کا یونانی زبان میں ترجمہ ہوا۔ اس کا نام 'SEPTUAGINT EDITION' ہے۔ بعد میں اس یونانی نسخہ کا ترجمہ عبرانی میں ہوا۔ یہ

---

[1] رینان صاحب ان "مقدس جعل سازیوں" سے اس درجہ متأثر ہوئے ہیں کہ پورے کے پورے مشرق کے متعلق بلا استثناد فتویٰ صادر فرما دیا۔

یونانی نسخہ[1] اسکندریہ کی لائبریری میں تھا۔ (اس لائبریری کو عیسائیوں نے نذرِ آتش کر دیا تھا) عیسائی علماء نے انجیل کے نسخوں میں اور اس کے علاوہ دوسرے لٹریچر میں جو کچھ عہد نامہ عتیق سے نقل کیا ہے وہ اسی یونانی ترجمہ سے تھا اور حال کی تحقیق یہ ہے کہ یہ یونانی ترجمہ عزرا کی کتابوں کا ترجمہ نہیں بلکہ سماراوالوں کی کتابوں کا ہے، جن کی یروشلم کے یہودیوں سے سخت عداوت تھی۔ جوزیفس کا خود اپنا بیان ہے کہ:۔

"یہ کتاب (یعنی اس کی تاریخ) پانچ ہزار سال کی تاریخ پر مشتمل ہے، جسے میں نے اپنی مقدس کتابوں سے مدون کیا ہے لیکن میں نے ان کا ترجمہ یونانی زبان میں کر دیا ہے۔"

(AGAINST APLON - 1ST. BOOK, SEC. 1)

یعنی عزرا کی اصلی کتابیں نہ کہیں الگ موجود ہیں نہ جوزیفس کی تاریخ میں۔ الگ بھی ان کے یونانی ترجمے ہیں اور جوزیفس کی تاریخ میں بھی یونانی زبان ہی میں ہیں۔ عبرانی نسخہ کے متعلق اوپر لکھا جا چکا ہے کہ وہ یونانی زبان سے ترجمہ کیا گیا تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ مروجہ عبرانی نسخہ اور یونانی کے مستند ترجمہ (سبعینہ) میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے اور اختلافات بھی اسی قسم کے کہ مثلاً، تخلیقِ آدم سے طوفانِ نوح تک کا زمانہ، عبرانی نسخہ کے مطابق (۱۶۵۶) سال کا ہے لیکن یونانی ترجمہ میں یہ مدت (۲۲۶۲) سال کی لکھی ہے۔ ۳۹۴ء میں سینٹ جیروم نے عہدِ عتیق کا مشہور رومی ترجمہ شائع کیا جو 'VULGATE' کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ترجمہ بہت مستند سمجھا جاتا ہے۔

عبرانی نسخے

یہ تو تھے تراجم عبرانی نسخوں کے متعلق پادری ہارن اپنی کتاب "دیباچہ علوم بائبل" میں لکھتا ہے:۔

عہدِ عتیق کی کتابیں دراصل عبرانی زبان میں تھیں اور وہ دو ناموں سے پکاری جاتی ہیں۔ ایک آٹوگرافس، یعنی وہ کتابیں جنہیں خود الہامی لکھنے والوں نے لکھا تھا اور ان کے سب نسخے ناپید ہو گئے۔ کوئی بھی موجود نہیں ہے۔ دوسرے ایپلوگرافس، یعنی وہ نسخے جو اصل نسخوں سے نقل ہوئے تھے اور جو نقل در نقل

---

[1] یعنی نسخہ سبعینہ جس کے متعلق جوزیفس کا بیان ہے کہ بادشاہ مصر بطلیموس فلاڈلفس اپنے کتب خانہ اسکندریہ کے لئے یہودی کتب مقدسہ کی ایک نقل چاہتا تھا۔ اس نے بہت سے یہودی غلاموں کو آزاد کر کے یروشلم کے کاہنوں کے پاس بھیجا۔ وہاں سے ستر علماء کو منتخب کر کے ایک جزیرہ میں بھیجا گیا، جہاں ان میں سے ہر ایک نے کتبِ مقدسہ کا الگ الگ ترجمہ کیا۔ آخر میں دیکھا گیا کہ ہر ایک کا ترجمہ لفظ بلفظ یکساں ہے۔ اسلئے یقین کر لیا گیا کہ یہ ترجمہ الہامی ہے۔ ستر علماء کی وجہ سے اسے سبعینہ کہا جاتا ہے۔

ہوتے ہوئے بہت کثرت سے پھیل گئے تھے۔ یہ مؤخر الذکر نسخے بھی دو قسم کے تھے۔

۱۔ پرانے، جو یہودیوں میں معتبر اور مستند مانے جاتے تھے مگر یہ نسخے بھی مدت سے معدوم ہو چکے تھے۔

۲۔ نئے جو سرکاری کتب خانوں میں یا دوسرے لوگوں کے پاس موجود ہیں۔ یہ پھر دو قسم کے ہیں ایک وہ جو معابد میں کام آتے ہیں اور دوسرے وہ جو عام لوگوں کے پاس ہیں۔

اس سے آپ نے اندازہ لگالیا ہوگا کہ عبرانی نسخے جو آجکل مروج ہیں، ان کا اصلی نسخوں سے کس قدر تعلق ہے؟ پھر ان نسخوں میں بھی اختلافات ہیں۔ اس قسم کے اٹھارہ اختلافی مقامات تو ایسے ہیں جو اب تک عبرانی نسخوں میں نقل ہوتے چلے آرہے ہیں اور ان کے متعلق لکھا ہوتا ہے کہ یہ احبارِ یہود کی تصحیحات ہیں۔ ان کے علاوہ اور متعدد مقامات پر مذکور ہوتا ہے کہ فلاں بات زیادہ صحیح ہے اور فلاں محض روائت ہے۔ عبرانی نسخے دوسری صدی عیسوی سے مختلف ادوار و منازل طے کرتے رہے تا آنکہ گیارھویں صدی میں ان سب کے تقابل سے ایک متفقہ علیہ نسخہ مدون کیا گیا جو اب تک مروج ہے۔ اس نسخہ میں مذکورہ صدر اختلافات کو حاشیہ پر لکھ دیا گیا ہے۔ سب سے پہلا نسخہ ۱۴۸۸ء میں چھپا لیکن جب ۱۷۰۵ء میں دوسرے ایڈیشن کا انتظام کیا گیا، تو پہلے ایڈیشن کے نسخہ سے بارہ ہزار جگہ سے اختلاف کرنا پڑا۔ طبع دوم کا نسخہ اب عام رائج ہے یہ ہے عہدِ عتیق کی کتابوں کی سرگزشت، جن کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار بائبل کے عنوان میں لکھتا ہے،۔

"عرصہ دراز تک کتبِ مقدسہ کا مطالعہ، جرح و تعدیل کے مسلمہ اصول سے محروم رہا۔ یہود محض اس عبرانی نسخہ کی پیروی کرتے تھے، جس کی نسبت مشہور تھا کہ غالباً دوسری صدی عیسوی میں مرتب کیا گیا تھا اور بعد ازاں احتیاط سے محفوظ رکھا گیا لیکن اس نسخہ میں چند تحریفات تو ایسی ہیں جو اب صاف صاف نظر آجاتی ہیں اور غالباً ایک کافی تعداد ایسی تحریفات کی بھی موجود ہے، جن کی شاید پورے طور پر قلعی نہ کھل سکے۔ عیسائی (اور اسکندریہ کے یہود) علماء کی حالت بہت ابتر تھی کیونکہ پانچویں صدی عیسوی تک، باستثنائے شاذ اور پانچویں صدی سے پندرھویں صدی تک بلا استثناء، ان سب بزرگوں نے ترجموں ہی پر اکتفا کیا۔

جرح و تعدیل کے آئینہ میں ان صحفِ مقدسہ کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ یورپ کے مؤرخین نے ان کتابوں کے باہمی تضاد و تناقض سے تنگ آکر یہاں تک کہنا شروع کر دیا ہے کہ ان میں جو کچھ لکھا ہے، سب افسانہ ہی افسانہ ہے۔ کتابِ دانیال کے متعلق، جس کی پیش گوئیوں پر عیسائیت کی تمام عمارت قائم ہے۔ کیٹو اپنے سائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ علاوہ ان عجائبات اور پیش گوئیوں کے، جو ایک مبصر کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتی ہیں۔

اس کتاب کا وہ حصّہ جو تاریخی کہلا سکتا ہے، یکسر افسانہ ہے اور ناممکنات کا مجموعہ"۔

ان کتابوں پر اس قسم کی تنقید کچھ دورِ حاضرہ کی "روشن خیالی" ہی کی پیداوار نہیں بلکہ قرونِ اولیٰ کے مبصرین نے بھی ان کے متعلق اسی قسم کی تنقیدات کی تھیں لیکن مذہب پرست طبقہ نے انہیں باقی نہ رہنے دیا۔ تیسری صدی عیسوی میں PRO - PHYRY نامی ایک بڑا فلاسفر گزرا ہے۔ اس نے قریب پندرہ جلدوں میں ان مزعومہ "کتب مقدسہ" پر تنقید لکھی اور بتایا کہ ان کی اصلیت کیا ہے لیکن عیسائی شہنشاہ قسطنطین کے حکم سے اس کی یہ تمام کتابیں جلادی گئیں اور حکم دے دیا گیا کہ جس کے پاس ان کا کوئی نسخہ ہوگا، اسے سزائے موت دی جائے گی۔ اس سے بھی پہلے قریب ۲۰۰ء میں 'CELSOS' نے اس قسم کی تنقیدی کتابیں لکھیں۔ ان کا بھی ویسا ہی حشر ہوا۔

تنقید

ازمنۂ سابقہ کی یہ تنقیدی کتابیں تو ہم تک نہ پہنچ سکیں لیکن عصرِ حاضر میں ان آسمانی کتابوں کے متعلق جو تحقیق ہوئی ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ قرآنِ کریم نے تحریف و الحاق کے علاوہ یہودیوں کے متعلق کہا تھا کہ:

فَوَيْلٌ لِّلَّذِينَ يَكْتُبُونَ الْكِتَابَ بِأَيْدِيهِمْ ثُمَّ يَقُولُونَ هَٰذَا مِنْ عِندِ اللَّهِ ..... (۲/۷۹)

"بدبختی ہے ان لوگوں کے لئے جو کتاب کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے ہیں اور پھر اس کے متعلق یہ مشہور کر دیتے ہیں کہ یہ من جانب اللہ ہے"۔

یعنی ان کی حالت یہ تھی کہ خود باتیں وضع کرتے اور انہیں پھر خدا کی طرف منسوب کر کے آسمانی کتابوں کا جزو بنا دیتے تھے۔ جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں ہے:-

"یہودیوں کے لٹریچر میں اس قسم کی تلبیس، یعنی خود لکھ کر اسے دوسروں کی طرف منسوب کر دینے کی عادت، بہت پرانی ہے۔ اعلیٰ ناقدین کی رائے کے مطابق کتب تورات کا بیشتر حصّہ ایسا ہی ہے"۔

اس قسم کی فریب دہی اور جعلسازی کو نہ صرف گذشتہ زمانہ میں ہی جائز سمجھا جاتا تھا بلکہ آج بھی یہود و نصاریٰ کی "دنیائے مذہب" میں اس "آرٹ" کو مستحسن قرار دیا جاتا ہے۔ مسٹر چیڈوک J.W. CHADWK اپنی کتاب "بائبل اوف ٹوڈے" میں لکھتا ہے:-

"جو لوگ اپنی تحریروں کو ان نامور ہستیوں کی طرف منسوب کر دیتے تھے جو ان سے بہت پہلے ہو گزرے تھے، ان کے متعلق اتنا تو ضرور ماننا جائے گا کہ وہ اپنی ان (تصنیفی) کوششوں کا سہرا اپنے سر نہیں باندھنا چاہتے تھے بلکہ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ ان کا مشن ترقی کرے۔ اگر ان کا مشن کامیاب ہوتا جائے تو وہ

اپنے آپ کو گوشۂ گمنامی میں رکھنے کی بھی پرواہ نہ کرتے تھے۔ چنانچہ یہ لوگ آج تک گمنامی کے پردے ہی میں مستور ہیں"۔

غور فرمائیے! کس طرح عیب کو ہنر بنا کر چمکایا جا رہا ہے! یعنی ان کے اس فریب اور تلبیس کو معیوب تصوّر کرنے کے بجائے، ان کے "ایثار و قربانی" کی داد دی جا رہی ہے کہ انہوں نے اپنے مشن کی کامیابی کی خاطر، اپنی شہرتِ دوام تک کو قربان کر دیا۔ خود گمنامی کی زندگی جئے اور گمنامی کی موت مرے لیکن اپنی جگرکاری اور سینہ سوزی کے نتائج و ثمرات کو اپنی طرف منسوب نہ کیا۔ (اس باب میں رینان کا بیان پہلے گزر چکا ہے۔)

یہ ہیں وہ تحریفات جن کے متعلق انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مضمون نگار نے لکھا ہے کہ:۔

"اگرچہ اس نسخہ کی بہت سی تحریفات صاف صاف نظر آرہی ہیں لیکن غالباً ایک کافی تعداد ایسی تحریفات کی بھی موجود ہے، جن کی اب یا شاید کبھی بھی قلعی نہ کھل سکے"۔

انتخاب کیسے ہُوا؟

تحریفات و تلبیسات کے اس انبارِ عظیم میں سے کتابوں کا انتخاب کس طرح ہُوا، اس کے متعلق جوزف اپنی کتاب JUDAISM AS CREED AND LIFE میں لکھتا ہے:۔

"جس فیصلہ کی رو سے بعض کتابیں عہدنامۂ عتیق میں شامل کر لی گئیں اور دوسری مسترد کر دی گئیں وہ فیصلہ انسانی تھا، خدائی نہ تھا۔ بڑے بڑے استادان کتابوں کو لے کر بیٹھ گئے اور محض اپنی فراست کی بنا پر یہ فیصلہ کر دیا کہ ان میں سے فلاں فلاں کتاب مستند ہے۔ بعض حالات میں یہ فیصلہ بہت مشکل ہو جاتا تھا۔ چنانچہ بعض کتابوں کے متعلق تیسری صدی عیسوی تک بھی فیصلہ نہ ہو سکا کہ انہیں کس زمرہ میں رکھا جائے"۔

پھر یہی مصنف آگے چل کر لکھتا ہے:۔

"بائبل چونکہ خداپرست انسانوں کا کارنامہ ہے، اس لئے اس میں لازمی طور پر خدائی اور انسانی دونوں عناصر شامل ہیں لیکن ہر شے جو انسانی ہو گی غیر مکمل ہو گی۔ اس لئے ہمیں یہ توقع نہیں رکھنی چاہیئے کہ ان آسمانی کتابوں میں خدا کی صداقت، صحیح صحیح طور پر پیش کر دی گئی ہے۔ جب روشنی کی شعاعیں کسی رنگین شیشہ سے گزریں گی تو یہ نہ صرف اپنی درخشندگی ہی کھو بیٹھیں گی بلکہ اس شیشہ سے مختلف رنگ بھی مستعار لیں گی۔ یہی کیفیت بائبل کی ہے۔ (اسے) اس کے علاوہ کچھ اور سمجھنا اس امر کے مرادف ہو گا کہ ان انسانوں کو انسانی حدود سے بلند لے جا کر خدائی دائرہ میں شامل کر دیا جائے"۔

کس قدر صاف اور واضح ہے یہ تبصرہ! پھر لکھتا ہے:۔
"بائبل کی بعض کہانیاں بالکل افسانے ہیں، اگرچہ نہایت حسین اور عبرت آموز۔ باقی رہے علوم و فنون، سو وہ اس زمانہ کی سطح کے مطابق ہیں، جس میں ان کتابوں کے مصنف پیدا ہوئے۔"

اور دیکھئے:۔
"یہی روایات اگرچہ اس امر پر زور دیتی ہیں کہ عہد نامۂ عتیق کی بعض کتابیں ان ہی کی لکھی ہوئی ہیں، جن کے حالات پر وہ مشتمل ہیں (اور اس کا باور کرنا کچھ غیر معقول نہیں) لیکن انہیں اس حقیقت کے اعتراف میں بھی ذرا تأمل نہیں کہ بعض کتابوں میں بعد میں ردّ و بدل اور حک و اضافہ بھی ہوا ہے۔"

(VALENTINE'S JEWISH ENCYCLOPAEDIA).

آگے چل کر لکھا ہے:۔
"تاریخ اور وقائع کے مستند ماخذ کی حیثیت سے بائبل کی حالت عام طور پر مایوس کن ہے۔ اس کے بیانات اور معلومات یا تو مبہم اور متضاد ہیں اور یا اس زمانہ کی تاریخ سے بالکل مطابقت نہیں رکھتے۔"
(صفحہ ۹۵)

خود جیوئش انسائیکلوپیڈیا میں ہے کہ:۔
"اگرچہ اسفارِ موسیٰؑ، خود حضرت موسیٰؑ کی تصنیف بتائی جاتی ہیں لیکن تحقیقِ جدید کی رُو سے ان کے قریب اٹھائیس مختلف مآخذ تسلیم کئے گئے ہیں۔" (جلد نمبر ۹)

پادری ڈملو نے بائبل کی مکمل تفسیر لکھی ہے، جس میں وہ اس حقیقت کا اعتراف کر کے کہ جو کتابیں حضرت موسیٰؑ کی طرف منسوب ہیں، درحقیقت حضرت موسیٰؑ کی لکھی ہوئی نہیں ہیں، بلکہ بعد کی تالیف ہیں، اس کی تائید میں بہت سے نظائر و شواہد پیش کرتا ہے اور اس کے بعد اس نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ:۔
"موسیٰؑ کی پانچ کتابیں اصل میں ایک شخص کی لکھی ہوئی نہیں ہیں بلکہ پہلی تحروں کی بنا پر بعد میں تالیف کی گئی ہیں۔"

سفرِ ایوب کے متعلق تو سپنگلر یہاں تک لکھ گیا ہے کہ اس کا انداز قطعاً یہودی نہیں بلکہ اسلامی ہے۔ (زوالِ مغرب جلد دوم صفحہ ۲۰۸)

'LESLIE PAUL' اپنی کتاب 'THE ANNIHILATION OF MAN'

میں اس باب میں رقمطراز ہے :-

"عہدنامۂ عتیق یا جدید، سائنٹفک اصطلاح میں، خدا کے الفاظ نہیں۔ یہ تو صرف اس انسانی کوشش کا ریکارڈ ہیں جو خدا تک پہنچنے کے لئے کی گئی۔ اس لئے یہ خدا کے متعلق انکشافات ہیں۔ خدا کی وحی نہیں ہیں"۔
(صفحہ ۱۷۵)

واضح رہے کہ اس کتاب کا مصنف عیسائیت کا بہت بڑا معتقد ہے۔

ستمبر ۱۹۶۲ء میں، لندن کے اخبار 'ڈیلی ٹیلی گراف' میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ عہدنامۂ عتیق کا ایک جدید انگریزی ترجمہ نیویارک سے شائع ہوا ہے۔ اس میں سردست، تورات کی پہلی پانچ کتابیں (اسفارِ موسیٰؑ) شامل ہیں۔ باقی کتابوں کا ترجمہ بعد میں بتدریج شائع ہوگا۔ یہ ترجمہ جیوئش پبلیکیشنز سوسائٹی اوف امریکہ کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس میں، علاوہ دیگر امور، یہ بھی کہا گیا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰؑ کی قیادت میں، بحرِ قلزم کو عبور نہیں کیا تھا۔ حضرت موسیٰؑ انہیں ایک اور راستے سے جو موجودہ نہر سویز کے قریب تھا، وادیٔ سینا کی طرف لے گئے تھے۔ یہ راستہ تھا جہاں سے (SEA OF REEDS) کا پانی پیچھے ہٹ چکا تھا اور اس وقت وہاں پانی کے بجائے دلدل تھا۔"[1]

داخلی شہادات

یہ تو ہیں مجموعۂ تورات کے متعلق خارجی شہادات۔ یعنی ان کتابوں کی تاریخی حیثیت۔ باقی رہیں داخلی شہادات، یعنی یہ کہ جو کچھ ان کتابوں کے اندر آج موجود ہے، اس کی کیا کیفیت ہے، سو اس کے متعلق آپ کبھی صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جب تک آپ انہیں خود نہ پڑھ لیں۔ (میں اس چیز پر اس لئے زور دے رہا ہوں کہ مجھے متعدد مقامات پر اس کا تجربہ ہو چکا ہے۔ وضعی تصنیفات جو مذہب کا مقدس نقاب اوڑھ لیں، ان کی عظمت و عقیدت کچھ اس طرح دل میں گھر کر لیتی ہے کہ اگر ان کے متعلق کہا جائے کہ ان میں اس قسم کی لغویات موجود ہیں تو کسی کا ماننے کو جی ہی نہیں چاہتا بلکہ وہ تصور میں بھی نہیں لانا چاہتے کہ ان میں فی الواقعہ اس قسم کی چیزوں کا امکان ہے لیکن جب ان کے سامنے کتاب کھول کر رکھ دی جائے تو دانتوں میں انگلی دبا کر رہ جاتے ہیں۔ اور شرم وندامت سے کتاب بند کر دیتے ہیں۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ انہیں خود پڑھا جائے۔ حضرات نوح، ابراہیم،

---

[1] غور فرمائیے۔ قرآن نے تیرہ سو سال پہلے یہ بات کہی تھی کہ حضرت موسیٰؑ بنی اسرائیل کو اس راستے سے لے گئے تھے جہاں سے پانی ہٹ چکا تھا۔

لوط، موسٰے، ہارون، داؤد، سلیمان علیہم السلام سب یہود کے نزدیک خدا کے مقدس رسول ہیں لیکن ان کے متعلق جو کچھ تورات کے مجموعۂ کتب میں موجود ہے، اس کے پیشِ نظر آپ ایک ثانیہ کے لئے بھی اسے تسلیم نہیں کر سکتے کہ یہ تعلیم خدا کی ہو سکتی ہے؟ لیکن حیرت ہے کہ یہ سب باتیں آج تک اس مجموعہ میں موجود ہیں اور "آسمانی" کہہ کر پیش کی جاتی ہیں۔

یہ تو رہا حضرات انبیاء کرامؑ کے متعلق۔ مذہب کی بنیاد خدا کے تصور پر ہوتی ہے۔ تورات میں خدا کا تصور کس قسم کا پیش کیا گیا ہے۔ اس کے متعلق JOSEPH WHEBSS اپنی کتاب IS IT GOD'S WORDS? میں لکھتا ہے:۔

"تورات کا خدا بے شمار قاتلوں کے بہائے ہوئے خون سے ہولی کھیلتا نظر آتا ہے۔ وہ خود بھی قاتل اور مفسد ہے۔ چور، غدار، انتقام کے جذبہ میں ایک خونخوار عفریت۔ گناہگار اور بے گناہ دونوں کو بے رحمی سے سزا دینے والا۔ نہایت مہیب اور خوفناک، ظلم اور تعصب کا مجسمہ، متکبر، شیخی باز، وعدہ خلاف غلط بیان اور ڈھٹائی سے جھوٹ بولنے والا۔"

معاذاللہ۔ استغفراللہ، جس کتاب میں خدائے بزرگ و برتر کا یہ تصور پیش کیا گیا ہو، اس کے متعلق خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ اسے خدا کی کتاب کہنا کس قدر زیادتی ہے۔

نگہِ بازگشت

جو کچھ گذشتہ صفحات میں لکھا جا چکا ہے، اگر آپ اسے بالترتیب ذہن میں محفوظ نہ رکھ سکے ہوں تو آگے بڑھنے سے پیشتر اس کی یاد پھر سے تازہ کر لیجئے۔ کہا یہ گیا ہے کہ:۔

۱۔ عہد نامۂ عتیق میں (جسے مجموعۂ کتب تورات کہا جاتا ہے) کل ۳۹ کتابیں ہیں۔ جن میں سے پانچ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت موسٰیؑ کی لکھی ہوئی ہیں لیکن ان میں حضرت موسٰیؑ کی وفات اور اس کے بعد کے حالات بھی مذکور ہیں۔

۲۔ ان (۳۹) کتابوں میں بعض ایسی کتابوں کے حوالے ملتے ہیں، جو آج ان میں موجود نہیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی زمانہ میں ان ۳۹ کتب کے علاوہ اور کتابیں بھی اس مجموعہ میں شامل تھیں۔

۳۔ بخت نصر کے حملۂ یروشلم کے بعد ان کتابوں کا وجود صفحۂ ہستی سے ناپید ہو چکا تھا۔

۴۔ ان کتابوں کو عزرا (فقیہہ) نے ۴۵-۴۴۴ ق م کے قریب از سر نو اپنے حافظہ کی مدد سے مرتب کیا۔ یعنی یروشلم کی تباہی کے قریب ڈیڑھ سو سال بعد۔ عزرا کے بیان کے مطابق ان مرتب کردہ کتابوں کی تعداد ۲۰۴ تھی۔

۵۔ جب دوسری صدی قبل مسیح میں یونانیوں نے یروشلم پر حملہ کیا ہے تو ان صحفِ مقدسہ کو پھر جلا دیا گیا۔ اس کے بعد

انہیں پھر مرتب کیا گیا۔

۶۔ پھر جب رومیوں نے ۷۰ء میں یروشلم کو تباہ و برباد کیا تو وہ ان کتابوں کو اپنے ساتھ روما لے گئے۔ مؤرخ جوزیفس کہتا ہے کہ یہ کتابیں وہاں سے ہے واپس ملیں لیکن اس نے ان کا یونانی ترجمہ اپنی کتابوں میں شامل کیا۔ وہ ان کتابوں کی تعداد ۲۲ لکھتا ہے۔

۷۔ یہودیوں کی زبان پہلے عبرانی تھی اور بابل سے مراجعت کے بعد ارامی لیکن تورات کا جو نسخہ دنیا کے سامنے آیا، وہ یونانی زبان میں تھا، جسے بادشاہِ مصر بطلیموس نے اسکندریہ کے کتب خانہ کے لئے تیار کرایا تھا۔ اس یونانی ترجمہ سے بعد میں عبرانی میں ترجمہ ہوا۔ لیکن عبرانی نسخوں میں اور اس یونانی نسخہ میں بھی اختلافات موجود ہیں۔

۸۔ نہ صرف یہ بلکہ عبرانی نسخوں میں بھی باہمی اختلافات تھے۔ گیارہویں صدی عیسوی میں یہودیوں نے ان تمام نسخوں کا باہمی مقابلہ کر کے ایک متفقہ علیہ نسخہ مرتب کیا اور اختلافی مقامات کو حاشیہ پر لکھ دیا۔ یہ نسخہ پندرھویں صدی میں پہلی مرتبہ چھپا۔ لیکن جب اس کے دوسرے ایڈیشن کی طباعت کی نوبت پہنچی تو پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں بارہ ہزار مقامات پر اختلاف کرنا پڑا۔ یہ نسخہ آجکل مروج ہے یعنی جو:-

(ا) نہ حضرت موسیٰ کا ہے۔

(ب) نہ عذرا فقیہہ کا۔

(ج) نہ اصل عبرانی زبان کا، بلکہ یونانی سے ترجمہ شدہ اور جس نسخہ سے ترجمہ کیا گیا تھا اس سے بھی مختلف۔

(د) اور سینکڑوں قسم کے اختلافی مقامات اپنے حاشیہ پر لئے ہوئے۔

(ہ) نیز پندرہویں صدی میں جو سب سے پہلا ایڈیشن چھپا تھا، اس سے ہزارہا مقامات میں مختلف۔

اب بھی بائبل کے ہر نئے ایڈیشن میں، سابقہ ایڈیشن سے عام طور پر کچھ اختلاف ہوتا ہے۔

۹۔ اس مجموعہ کے علاوہ بہت سی ایسی کتابیں بھی آج موجود ہیں۔ جنہیں اپوکریفہ (یعنی مخفی یا جعلی صحیفے) کہا جاتا ہے۔ لیکن سمجھا انہیں بھی مقدس جاتا ہے۔

۱۰۔ علاوہ بریں روایات و تفسیرات کا ایک عظیم الشان انبار ہے جسے وحیٔ غیر مکتوب قرار دے کر جزو سمجھا جاتا ہے۔

۱۱۔ ان تمام کتابوں پر شروع ہی سے تنقید ہوتی چلی آئی ہے لیکن دورِ حاضرہ کی تحقیق نے ان کی اصلیت کو بالکل بے نقاب کر دیا۔

۱۲۔ اور سب سے بڑی شہادت ان کی وضع و تحریف کی خود ان کتابوں کا متن ہے۔ ان میں ایسی ایسی باتیں مذکور ہیں جن

کے تصور سے روح کانپتی ہے۔ ان میں کہیں (معاذاللہ) حضرت نوحؑ شراب میں بدمست برہنہ دکھائی دیتے ہیں اور کہیں (پناہ بخدا) حضرت لوطؑ نشہ میں مخمور اپنی بیٹیوں سے .... کہیں (توبہ توبہ) حضرت ابراہیمؑ جھوٹ بولتے بتائے گئے ہیں اور کہیں (معاذاللہ) حضرت یعقوبؑ اپنے والد کو فریب دے کر حقِ وراثت چھینتے۔ کہیں (توبہ توبہ) حضرت موسیٰؑ پر کوشی عورت کا اتہام لگایا گیا ہے اور کہیں حضرت ہارونؑ کو (معاذاللہ) گوسالہ پرستی کرتے اور کراتے دکھایا گیا ہے۔ کہیں (خاکم بدہن) حضرت داؤدؑ اپنے پڑوسی کی بیوی پر فریفتہ ہو کر اسے اپنے قبضہ میں لاتے نظر آتے ہیں اور کہیں (معاذاللہ) حضرت سلیمانؑ اپنی بیویوں کے اثر میں آکر بتوں کی پرستش کرتے۔ وقس علیٰ ھذا اور پھر خدا کے متعلق جو تصور ان کتابوں میں پیش کیا گیا ہے، اس کا خیال کرنے سے بھی حیا کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ دورِ حاضرہ کے مغربی محققین نے ان کتابوں کو وضعی اور افسانوں کا مجموعہ قرار دیا ہے۔

یہ ہے مذہب یہودیت کی مبینہ آسمانی کتابوں کی حقیقت۔ اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ انہیں خدا کی سچی کتابیں سمجھنا یا قرار دینا کس قدر غلط ہے۔

باب دوم

عیسائیت

عہد نامۂ جدید ۔ اناجیل

اگرچہ عیسائی (اور غیر عیسائی) لٹریچر میں، حضرت عیسیٰؑ کے کوائفِ حیات کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، لیکن بایں ہمہ، آپ کی زندگی کے ابتدائی حالات ابھی تک سامنے نہیں آسکے۔ اناجیل کی رُو سے آپ کی پیدائش کے تھوڑے دنوں بعد، حضرت مریمؑ اور ان کے شوہر نومود کو ساتھ لے کر مصر چلے گئے، جہاں سے اس وقت واپس آئے، جب بچے کی عمر سات برس کی ہو چکی تھی لیکن تاریخی تنقید کی روشنی میں یہ بیان بھی صحیح معلوم نہیں ہوتا اور عصرِ حاضر کے مکتشفین کی رائے ہے کہ آپ کی زندگی کے تیس سال تک کے حالات بالکل گمنامی کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں اور سفرِ حیات کے صرف آخری مراحل کی کیفیات دنیا کے سامنے آسکی ہیں۔ جب آپ فلسطین واپس آئے ہیں۔ 'MOSHIEM' مسیحی دنیا کا ایک بہت بڑا مورخ ہے۔ جس کی "تاریخِ کلیسا" عیسائیوں کے ہاں مستند صحیفہ سمجھی جاتی ہے۔ وہ اس باب میں لکھتا ہے:۔

> "آپ کی بقایا زندگی (یعنی پیدائش کے تھوڑے دنوں بعد سے) بالکل نجی حیثیت سے گوشۂ ظلمت میں گذری، حتیٰ کہ آپ کی عمر تیس سال کی گئی۔"

اس کے بعد یہی مورخ لکھتا ہے:۔

> "بہت سے مصنفین نے، اپنے تصورات کی دنیا میں مست، یا عام لوگوں کی توجہات کو مرکوز کرنے کے لئے، ہمارے منجیؑ (حضرت مسیح) کی زندگی کے (مذکورہ صدر) گمنام گوشے کے متعلق عجیب و غریب مضحکہ خیز افسانے وضع کر رکھے ہیں۔"

ایک قیاس یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس عرصہ میں (جس کے متعلق آپ کی مقدس زندگی کے حالات و کیفیات ابھی تک لوگوں کے سامنے نہیں آسکے) آپ ایسین فرقہ ESSENES سے متعلق رہ کر زہد و ریاضت کی زندگی بسر کرتے رہے ہوں، تاآنکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت عطا فرما دی اور پھر آپ اپنی دعوتِ انقلاب کو لے کر مراجعت فرمائے یروشلم ہوئے۔ چونکہ

جو موضوع ہمارے پیش نظر ہے، اس کے سلسلہ میں اس فرقہ کے اکثر لوگ نمایاں طور پر اِدھر اُدھر دکھائی دیں گے، اس لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ان کے متعلق ذرا تفصیلی معلومات سامنے آجائیں۔

ایسینی فرقہ

جوزیفس کی "تاریخ اسلاف" کی رُو سے (جس کا ذکر تورات کے بیان میں گزر چکا ہے):-

۱۴۴ سنہ ق.م کے قریب، یہودیوں میں تین فرقے موجود تھے۔ جن کے انسانی اعمال و معاملات کے متعلق مختلف خیالات تھے۔ ایک فریسی، دوسرا صدوقی اور تیسرا ایسین۔

کہا جاتا ہے کہ ESSENE کلدانی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی "ڈاکٹر" (یعنی طبیب) کے ہیں۔ یونانی میں ان کا نام THERAPEUTAE تھا، جس کے معنی آج بھی "ڈاکٹر" ہی کے ہیں۔ یہ فرقہ ابتدائی ایام سے بابل کے ملحقات میں پایا جاتا تھا۔ ان کی تعلیم، یونان کے حکمائے اشراقین سے ملتی جلتی تھی (یوں سمجھئے کہ یہ اس عہد کے صوفی تھے) لیکن اس وقت ان کے معتقدات پر زرتشتی تعلیم، بالخصوص متھرا 'MITHRA' کی پرستش کے امیال و عواطف کا زیادہ اثر تھا۔ یونانی حکیم فیثا غورث نے جس "مجلسِ اخوت" کی بنیاد رکھی تھی، اس فرقے نے اسے ایک منظّم صورت میں متشکل کر دیا اور یہی تنظیم ان کی نمایاں خصوصیت تھی۔ مسیحی مؤرخ یوسی بس 'EUSEBIUS' نے فیلو 'PHILO' کے حوالہ سے ان کے متعلق معلومات اپنے ہاں محفوظ کر رکھی ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ درویش منش، مرنجاں مرنج زندگی بسر کرتے تھے اور ایک آنے والے "مسیحا" کے منتظر تھے جو دنیا میں عدل و مساوات کا نظام قائم کرنے والا تھا۔ یہ لوگ اپنی سچائی کے لئے مشہور تھے اور خدا کے سوا کسی کو اپنا آقا تسلیم نہیں کرتے تھے۔ ان کی زندگی نہایت ضبط و انضباط 'DISCIPLINE' کی تھی بلکہ اس میں بہت زیادہ تشدّد برتتے تھے۔ ان کی ایک شاخ تجرّد کی زندگی کی قائل تھی اور دنیاوی حظائظ و لذائذ کے ترک میں روحانیت کی نشو و ارتقاء کا راز مضمر سمجھتی تھی۔ جو کچھ ان کے ملک میں ہوتا، وہ سب ایک جگہ مشترک طور پر اپنے امیر کی تحویل میں رکھ دیتے۔ امیر ہی ان کی اطاعت کا مرکز تھا۔ جوزیفس لکھتا ہے:-

> "ان لوگوں کا زُہد و ورع بلا کا ہے۔ سورج نکلنے سے پیشتر وہ اُٹھ بیٹھتے ہیں اور دنیاوی معاملات کے متعلق بات چیت کرنے سے پہلے اپنی عبادت سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد جن جن باتوں میں وہ ماہر ہوتے ہیں۔ ان کا امیر (صدر) انہیں ان امور کی سرانجام دہی کے لئے بھیج دیتا ہے۔ واپس آکر وہ ٹھنڈے پانی سے غسل کر کے، سفید لباس پہن لیتے اور عبادت خانہ میں جمع ہو جاتے ہیں۔ دعاؤں اور مناجاتوں کے بعد کھانا کھاتے ہیں، جس کے اوّل و آخر خدا کا شکر ادا کیا جاتا ہے۔ وہ ہر معاملہ میں

اپنے امیر کے حکم کے تابع رہتے ہیں .... ان میں سے بعض لوگ آئندہ کی باتوں کے متعلق پیشگوئیاں بھی کرتے ہیں اور مذہبی کتابوں پر خاص طور پر عبور رکھتے ہیں۔ ان کا عقیدہ ہے کہ دنیا میں سب کچھ خدا کی مشیت کے تابع ہوتا ہے اور اس کے حکم کے خلاف کچھ نہیں ہو سکتا۔"

ان کے متعلق اسی قسم کے خیالات 'PLINY' المتوفی ۷۹ء نے بھی لکھے ہیں:۔

"یہی ایک فرقہ ہے جس کے لوگ بغیر مال و متاع اور زن و اولاد کے زندگی بسر کرتے ہیں اور کھجوریں وغیرہ کھا کر زندہ رہتے ہیں۔ وہ لوگ جو زندگی کی مشکلات و صعوبات سے گھبرا اٹھتے ہیں، ان میں آکر شامل ہو جاتے ہیں۔ قریب قریب ہر بستی میں اس فرقہ کے لوگ موجود ہیں جو اپنے فرقہ کے مسافروں کی اس طرح تواضع کرتے ہیں، گویا وہ خود ان ہی میں سے ہیں، خواہ انہوں نے ایک دوسرے کو پہلی مرتبہ ہی کیوں نہ دیکھا ہو۔ جب وہ سفر کے لئے نکلتے ہیں تو اپنی مدافعت کے ہتھیاروں کے علاوہ اور کچھ (زادِ راہ وغیرہ) ساتھ نہیں رکھتے۔ ہر بستی میں ان کے فرقہ کا ایک امیر ہوتا، جس کے ذمہ ان مسافروں کی دیکھ بھال ہوتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کے ہاتھ خرید و فروخت نہیں کرتے تھے بلکہ جس کے پاس کچھ فاضلہ ہو، وہ اس کے حاجتمند کو بلاقیمت دے دیتا ہے۔"

فیلو 'PHILO' المتوفی ۵۰ء کے بیان کے مطابق، اس فرقہ کی بستیوں میں معابد اور خانقاہیں ضرور ہوتیں۔ خانقاہوں میں یہ لوگ روحانیت کی بلند و بالا زندگی کے لئے بڑی بڑی پُراسرار ریاضتیں کرتے اور اپنے اسرار و بواطن کسی کو نہ بتاتے، خواہ ان کی جان پر بھی بن جاتی۔ ان کے پاس ازمنۂ قدیم کے نوشتے بھی محفوظ رہتے اور ان نوشتوں میں ساتھ کے ساتھ اضافہ بھی ہوتا رہتا۔ خدمتِ خلق ان کا مسلک اور بیماروں کا علاج سب سے نمایاں فریضہ ہوتا اور یہ سب کچھ بلا مزد و معاوضہ سرانجام دیا جاتا۔"

حضرت عیسیٰؑ بنی اسرائیل کی گم گشتہ بھیڑوں کی طرف مبعوث ہوئے لیکن ان بھیڑوں نے آپ سے بھیڑیوں کا سا سلوک کیا۔ البتہ آپ کے گرد مقدس حواریوں کی ایک جماعت جمع ہو گئی جو آپ کی تعلیم کی علم بردار اور آپ کی دعوت انقلاب کی مبلغ تھی۔ قیاس یہ ہے کہ حواری اسی فرقہ ایسین ہی کے افراد تھے۔ حضرت عیسیٰؑ نے ان عقائد و تصوراتِ زندگی کے ان

حواری

گوشوں کی اصلاح فرمائی، جن میں غیر خدائی تعلیم کے اثرات داخل ہو گئے تھے اور اس طرح یہ مخلص گروہ خالص توحید کا پیامبر بن گیا۔ حضرت عیسیٰؑ کو اپنی دعوتِ انقلاب کے آخری مراحل میں جو واقعہ پیش آیا،

اس کے بعد اس جماعت پر بھی طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہوئیں، جن کی وجہ سے وہ ادھر ادھر بکھر گئے لیکن جونہی حالات نے مساعدت کی، انہوں نے بیت المقدس میں ایک خاص صوفیانہ قسم کا حلقہ قائم کر لیا۔ جس کی خصوصیات کم و بیش وہی تھیں۔ جن کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ "رسولوں کے اعمال" میں ہے:-

"پس جن لوگوں نے ان کا کلام قبول کیا، انہوں نے بپتسمہ لیا اور اسی روز تین ہزار آدمیوں کے قریب ان میں مل گئے' اور یہ رسولوں سے تعلیم پانے اور رفاقت رکھنے اور روٹی توڑنے اور دعا مانگنے میں مشغول رہے اور ہر شخص پر خوف چھا گیا' اور بہت سے عجیب کام اور نشان رسولوں کے ذریعے سے ظاہر ہوتے تھے اور جو ایمان لائے تھے، وہ سب ایک جگہ رہتے تھے اور ساری چیزوں میں شریک تھے اور اپنی جائیداد اور اسباب بیچ بیچ کر ہر ایک کی ضرورت کے موافق سب کو بانٹ دیا کرتے تھے اور ہر روز یک دل ہو کر ہیکل میں جمع ہوا کرتے اور گھروں میں روٹی توڑ کر خوشی اور سادہ دلی سے کھانا کھایا کرتے تھے اور خدا کی حمد کرتے اور سب لوگوں کو عزیز رکھتے تھے۔"

(رسولوں کے اعمال ۴۷-۴۱/۲)

اس حلقہ کے افراد اور یہودیوں میں کچھ خاص فرق نہ تھا، اس لئے کہ شریعت کے احکام دونوں کے لئے قریب قریب ایک ہی تھے۔ البتہ یہودی آنے والے مسیح کے منتظر تھے اور ان کے برعکس، یہ لوگ کہتے تھے کہ وہ آنے والا آچکا۔ اس وقت تک حضرت عیسیٰؑ کے متبعین نے اپنا الگ نام بھی نہیں رکھا تھا[1]۔ اس کے بعد جب سینٹ پال (پولوس) جو پہلے یہودی تھا اور حضرت عیسیٰؑ کے متبعین کو سخت ایذائیں پہنچایا کرتا تھا' عیسائی ہو گیا تو اس نے سینٹ برنباس کی معیت میں' انطاکیہ میں مسیحیت کی عام منادی شروع کر دی۔ یعنی حضرت عیسیٰؑ نے تو (انجیل کی روایت کے مطابق) یہ فرمایا تھا کہ میں صرف بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوا ہوں اور "بیٹوں کی روٹی کتوں کے آگے" ڈالنے کے لئے نہیں آیا، لیکن سینٹ پال نے اس تعلیم کے علی الرغم غیر یہود میں بھی مذہب عیسائیت کو پھیلانا شروع کر دیا۔ اس وقت یہ مسئلہ درپیش

---

[1] انجیل کی رُو سے ان کا نام "کرسچن" پہلے پہل ۴۳ء میں رکھا گیا (اعمال ۱۱/۲۶) لیکن انسائیکلوپیڈیا اوف ریلیجس نالج میں لفظ "کرسچن" کے تحت لکھا کہ یہ ان کا نام قریب ۶۵ء میں رکھا گیا اور رکھا بھی ان کے دشمنوں نے از راہِ طعن و تعریض۔ انہیں "کرسچن" یعنی تیل اور چربی مل کر گندے رہنے والے کہا کرتے تھے۔ CHRIST کے معنی تیل یا چربی سے مسح کرنے والے ANDINTED کے ہیں۔ یہ یونانی لفظ 'GREASER' کے مرادف ہے۔

کرسچن؟ ہوا کہ جو غیر یہود عیسائیت قبول کریں، ان پر شریعت کے احکام کی پابندی کہاں تک ضروری ہے۔ اس کے متعلق انجیل میں (اعمال باب پندرہ) تفصیل موجود ہے۔

اس طرح عیسائیت، یہودیت کے دائرہ سے نکل کر غیر یہود GENTILES تک بھی پہنچنی شروع ہوگئی۔ (یعنی حضرت عیسیٰؑ کے اوّلین مخاطب صرف بنی اسرائیل، یعنی یہود تھے لیکن اب غیر بنی اسرائیل، یعنی غیر یہود بھی عیسائیت کے دائرہ

غیر بنی اسرائیل میں آنے شروع ہوگئے) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب ۷۰ء میں یہودیوں کا شیرازہ بکھرا تو عیسائیت پر غیر یہودی عنصر بہت غالب آگیا، جس کی وجہ سے عیسائیت اپنی تعلیم سے الگ ہو کر کچھ کا کچھ ہوگئی۔ ایسین فرقہ میں اگرچہ یہودی بھی شامل ہوتے تھے لیکن وہ یہود اور غیر یہود سب کو اپنی آغوش میں لے لیتے تھے۔ اب یوں سمجھئے کہ وہ عیسائیت جو پہلے صرف بنی اسرائیل تک محدود تھی، ایسین فرقہ کے اثر میں آگئی۔ یروشلم کی تباہی کے بعد عیسائی کلیسا، شام میں قائم ہوا لیکن اس میں یہودی عنصر بہت کم رہ گیا۔ رفتہ رفتہ جب حالات مساعد ہوئے تو کلیسا پھر یروشلم میں منتقل ہوگیا لیکن جب ۱۳۲ء میں یہودیوں نے پھر یورش برپا کی تو انہیں حکومت کی طرف سے یروشلم میں آنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس سے یہودی عنصر اور بھی کم ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ جب ۳۲۵ء میں نیقیہ کی مشہور کونسل منتخب ہوئی ہے، تو عیسائیت ایک بالکل جداگانہ اور یہودیت سے الگ مذہب کی صورت میں متشکل ہوگئی۔ اب باپ، بیٹا اور روح القدس (اقانیم ثلاثہ) مقامِ الوہیت کے مستقل بالذّات رکن تسلیم کئے گئے اور کونسل نے فیصلہ دے دیا کہ:۔

> "جو شخص دعویٰ کرے کہ کسی وقت، خدا کے فرزند کا وجود نہ تھا، یا وہ نیست سے ہست کیا گیا یا کسی ایسے مادہ یا جوہر سے اس کی تخلیق ہوئی جو ربّانی نہیں ہے یا وہ مخلوق یا متغیر ہے، ایسے شخص کو کلیسائے مقدس ملعون قرار دیتا ہے۔"

تثلیث اس عقیدہ کو قسطنطین نے حکومت کے قانون کی حیثیت سے نافذ کر دیا۔ اس طرح تثلیث عیسائیت کا بنیادی عقیدہ قرار پا گئی اور پھر رفتہ رفتہ یونانیوں اور مصریوں کے توہمات اور رسومات اس مذہب کے اجزا بنتے چلے گئے۔ اس کے قریب ایک سو سال بعد، حضرت مریمؑ کی پرستش بھی بہ حیثیت "خدا کی والدہ" کے جزوِ مذہب قرار پا گئی۔

ہم نے یہ طولانی تمہید اس لئے پیش کی ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ حضرت عیسیٰؑ کی وہ تعلیم جو سابقہ انبیائے کرامؑ کے اصولی پیغام خداوندی پر مشتمل تھی، آہستہ آہستہ کیا سے کیا ہوگئی۔ اس تمہید کے بعد اناجیل کی صحیح حیثیت آسانی سے

سمجھ میں آجائے گی۔

حضرت عیسیٰؑ جو صحیفۂ ربانی (انجیل) اپنے حواریوں کو دے کر گئے تھے، تاریخ اس کے متعلق بالکل ساکت ہے۔ آپ کی تشریف براری کے بعد، چونکہ عام عقیدہ کے مطابق، عیسائی آپ کی واپسی کے منتظر تھے (اور اصل بات یہ تھی کہ حواریوں کی انقلاب پسند جماعت پر بڑی پریشانی کا زمانہ گزر رہا تھا) اس لئے انجیل کی ترتیب و تدوین کی طرف کسی کی توجہ نہ ہو سکی۔

اناجیل بعد میں جب عیسائی کلیسا، یہودی اور غیر یہودی عناصر کی کشمکش کی رزم گاہ بن گیا تو ان مختلف خیال فرقوں نے اپنی اپنی انجیلیں مرتب کرنا شروع کر دیں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کی تحقیق کی رُو سے اس زمانہ میں قریب (۳۴) اناجیل کا پتہ چلتا ہے۔ یہ اناجیل درحقیقت حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات تھیں جنہیں اُن روایات کی رُو سے مرتب کیا گیا تھا جو اس زمانے میں عام طور پر رائج تھیں۔ سپنگلر لکھتا ہے:۔

> "جب (حضرت مسیحؑ) کے دوست اور شاگرد بوڑھے ہو گئے اور یروشلم میں اس جماعت کا صدر آپ کا بھائی تھا تو انہوں نے ان قصص و روایات کو جو عام طور پر زبان زدِ خلائق تھیں، یکجا مرتب کر کے آپ کی سوانح عمری مرتب کی — یہی انجیل ہے۔" (زوالِ مغرب، جلد دوم، صفحہ ۲۱۲)

حضرت عیسیٰؑ اور آپ کے حواریوں کی زبان ارامی تھی لیکن حیرت ہے کہ ان (۳۴) اناجیل میں سے (سوائے ایک کے جواب مفقود ہے) کوئی بھی ارامی زبان میں نہ تھی۔ سب کی سب یونانی زبان میں لکھی گئی تھیں۔ ان کے علاوہ ایک بڑی تعداد ان خطوط کی تھی جو حواریوں کی طرف منسوب کئے جاتے تھے۔ ان کی تعداد قریب (۱۱۳) تک شمار ہوتی تھی۔ نیقیہ کی مشہور کونسل (منعقدہ ۳۲۵ء) میں یہ تمام لٹریچر سامنے رکھا گیا اور ان سے چار اناجیل (متی، مرقس، لوقا، یوحنا) رسولوں کے اعمال، پولوس، یعقوب، پطرس، یوحنا اور یہودا کے خطوط اور مکاشفات یوحنا منتخب کر لئے گئے اور باقی اناجیل اور خطوط کو وضعی (اپوکریفہ) قرار دے دیا گیا۔ جو کچھ منتخب کیا گیا، اسے عہد نامۂ جدید کہا جاتا ہے۔ دنیائے عیسائیت میں یہ مقدس آسمانی کتابیں سمجھی جاتی ہیں۔ چاروں اناجیل، حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات ہیں، جنہیں آپ کے حواریوں نے مرتب کیا۔ (اس کا تفصیلی تذکرہ آگے چل کر آئے گا) رسولوںؑ کے اعمال" آپ کے حواریوں کے کارناموں کا تذکرہ ہے۔ خطوط وہ ہیں جو مختلف کلیساؤں اور دوسرے لوگوں کے نام تبلیغی طور پر لکھے گئے اور مکاشفات، یوحنا حواری کے مکاشفہ پر

ؑ انجیل میں حواریوں کو رسول اور نبی کہا گیا ہے۔ (دیکھئے اعمال ۶-۲/۱۴ و ۱۵/۳۲)

پر مشتمل ہے۔ نیقیہ کی کونسل میں ان کتابوں کا انتخاب بھی عجیب و غریب طریق سے عمل میں آیا۔ یہ کونسل شاہنشاہ قسطنطین

انتخاب

کے زیرِ اہتمام منعقد ہوئی تھی۔ اس میں سلطنت روما کے اطراف و جوانب سے دو ہزار اڑتالیس مندوبین شامل ہوئے۔ قسطنطین نے خود اس کی صدارت کی۔ اس کونسل کے انعقاد سے مقصد یہ تھا کہ کلیسا کے مختلف فرقوں میں جو اختلافات پیدا ہو چکے ہیں، ان میں باہمی تطبیق و توفیق کی صورت پیدا کر کے ایک متفقہ علیہ مذہب کی تشکیل ہو جائے۔ کونسل کی بحث و جدل نے ایسی شدت اختیار کی کہ (۱۷۳۰) مندوبین کو باہر نکال دینا پڑا۔ بقایا (۳۱۸) بھی کسی متفقہ فیصلہ پر نہ پہنچ سکے کہ مختلف فرقوں کی اناجیل میں سے کسے باقی رکھا جائے اور کسے مسترد کر دیا جائے۔ بالآخر انہوں نے ایک رات تمام کتابوں کو فرش پر بکھیر دیا۔ صبح آکر دیکھا تو کچھ کتابیں اور خطوط میز کے اوپر رکھے تھے۔ ان صحیفوں کو مقدس سمجھ کر منتخب کر لیا گیا اور باقی کتابیں مسترد قرار پا گئیں۔ چنانچہ اس کونسل کی روئیداد مذکور ہے کہ:-

"جو کچھ ان تین سو پادریوں نے متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا، اسے خداوند کی خوشنودی سمجھ لینا چاہیئے۔ بالخصوص اس لئے کہ ان قابل ہستیوں کے دل میں روح القدس سما رہا تھا۔ جس نے انہیں خداوند کی مرضی کی طرف راہ نمائی کر دی۔"
(HISTORICAL ASPECT OF THE COUNCIL OF NICAEA — BY REV. ISSAC BOYLE.)

یہ ہے عہد نامۂ جدید کی مقدس آسمانی کتابوں کے انتخاب کی داستان، جیسا کہ آپ پچھلے صفحات میں دیکھ چکے ہیں، عہد نامہ عتیق کی کتابوں کا انتخاب علمائے یہود نے اپنی فہم و فراست سے کیا تھا لیکن عہد نامۂ جدید کے معاملہ میں اس سے بھی عجیب تر طریقِ انتخاب کا استعمال کیا گیا۔

متی کی انجیل

ان کتابوں میں، عیسائیوں کے عقیدہ کے مطابق متی کی انجیل سب سے قدیم ہے لیکن اس کے متعلق نہ تو یہی متعین ہو سکا ہے کہ اس کا مؤلف کون ہے اور نہ ہی یہ کہ یہ کس سن میں مرتب ہوئی۔ دورِ حاضرہ کی تحقیق کا رجحان اس طرف ہے کہ جس حصہ کا مؤلف حواری متی تھا، وہ حصہ اسی زمانہ میں شائع ہو گیا تھا۔ اب جو کچھ باقی ہے۔ اس کے مؤلف نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا۔ عہدِ تالیف کے متعلق عام طور پر خیال ہے کہ یہ ۶۱ء اور ۶۵ء کے درمیان مرتب ہوئی لیکن پروفیسر ہارنک کے نزدیک اس کا زمانۂ تالیف ۸۰ء اور ۱۰۰ء کے درمیان ہے۔ بہرحال زمانۂ تالیف ۶۱ء ہو یا ۱۰۰ء، تاریخ کے صفحات میں اس انجیل کا نشان ۱۷۳ء سے قبل نہیں ملتا۔ یہ انجیل یونانی زبان میں لکھی گئی تھی اور محققین کا خیال ہے کہ اس کا عبرانی ترجمہ، جیروم نے ۴۰۰ء میں کیا تھا۔ (اگرچہ اس کا دعویٰ تھا کہ اس نے ترجمہ نہیں کیا بلکہ اسے کہیں سے خود عبرانی نسخہ مل گیا تھا)۔

مرقس بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ سب سے قدیمی انجیل، متی کی نہیں بلکہ مرقس کی ہے۔ جس کا ذکر سب سے پہلے یوسی بس نے اپنی تاریخ کلیسا میں، چوتھی صدی میں کیا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مرقس نے (جو یہودی الاصل تھا) ۶۴ء میں اسے لکھا تھا۔

لوقا تیسری انجیل لوقا کی ہے۔ یہ غیر یہودی مؤرخ تھا اور خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے پہلی صدی کے اخیر میں اس انجیل کو مرتّب کیا۔

یوحنا چوتھی انجیل یوحنا کی ہے۔ اگرچہ اسے حضرت مسیحؑ کے حواری یوحنا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے لیکن تحقیق جدید یہ ہے کہ اس کا مؤلف ایک اور یوحنا تھا جو ایشیائے کوچک کا رہنے والا تھا۔ اس نے پہلی صدی کے اخیر میں اس انجیل کو مرتب کیا۔ اس انجیل میں فلسفۂ یونان کی پوری پوری چاشنی موجود ہے۔

ان اناجیل کے متعلق موسیو رینان کی تحقیق اور رائے ہر صاحبِ نظر کے لئے قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"چونکہ (حضرت مسیح کی تشریف براری کے بعد) لوگوں کا عقیدہ یہ تھا کہ دنیا کا عنقریب خاتمہ ہونے والا ہے، اس لئے انہوں نے مستقبل کے لئے کتابیں تصنیف کرنے کی طرف کوئی دھیان نہ دیا۔ ان کے لئے فقط اتنا ہی کافی تھا کہ جس (شخصیت) کے متعلق انہیں انتظار تھا کہ وہ اسے بادلوں کے اندر دوبارہ دیکھیں گے، اس تصور کو اپنے آئینۂ قلب میں آویزاں رکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتدائی ڈیڑھ سو سال میں اناجیل کو کوئی مستند حیثیت حاصل نہ تھی۔ ان میں اضافے کرنے یا مختلف انداز سے ترتیب دینے، یا ایک کی تکمیل دوسرے سے کرنے میں کوئی باک اور تامّل نہ تھا۔" (حیاتِ مسیح، صفحہ ۱۱۲)

دوسری جگہ مذکور ہے:۔

"ابتداءً اناجیل کی حیثیت بالکل انفرادی تھی اور سند کے اعتبار سے ان کا درجہ روایت سے بھی بہت کم تھا۔" (صفحہ ۲۱۴)

یوحنا کی انجیل کے متعلق یہ مؤرخ رقمطراز ہے:۔

"میں کبھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ چوتھی انجیل تمام کی تمام گلیلی کے ماہی گیر کے قلم کی لکھی ہوئی ہے۔ ... حقیقت یہ ہے کہ اس میں اکثر اضافے بعد کے ہیں۔" (صفحہ ۱۴ و ۱۸)

سینٹ پال کا سابقہ ڈین ڈاکٹر W.R. INGE اپنی کتاب THE FALL OF THE IDOLS میں لکھتا ہے:۔

"بہت کم علماء ایسے ہوں گے جو اس باب میں اختلاف کرتے ہوں کہ انجیل چہارم (یوحنا) ایشیائے کوچک کے کسی گمنام تصوف پسند نے ۹۵ء اور ۱۲۵ء کے درمیان لکھی تھی۔" (صفحہ ۲۶۱)

متی اور یوحنا کے بیانات کا ذکر کرنے کے بعد موسیو رینان لکھتا ہے:۔

"اگر مسیح نے ویسے ہی باتیں کی تھیں جیسے متی نے لکھا ہے تو یقیناً وہ (مسیح) یوحنا کے مطابق باتیں نہیں کر سکتا تھا۔ (یعنی متی اور یوحنا کے اسلوب و انداز میں اس قدر بین فرق ہے کہ ایک ہی شخص ایسے متضاد انداز میں باتیں کبھی نہیں کر سکتا تھا۔" (صفحہ ۱۶)

لوقا کے متعلق رینان کا بیان ہے:۔

"اس انجیل کی تاریخی حیثیت بہت کمزور ہے۔ یہ صحیفہ ہم تک دوسرے ہاتھوں سے پہنچا ہے...... اس میں کئی فقرے موڑے توڑے ہوئے اور مبالغہ آمیز ہیں........ اسے تو (یروشلم کے) ہیکل کے متعلق بھی صحیح اندازہ نہیں۔"

ہر چہار اناجیل کے متعلق لکھتا ہے:۔

"یہ اناجیل کھلے طور پر ایک دوسرے کی تردید کرتی ہیں۔" (صفحہ ۲۹)

پھر جیسی کچھ یہ کتابیں ہیں، ان میں بھی پند و نصائح کے اقوال ہیں۔ شریعت اور ضابطہ کے قوانین کوئی نہیں۔ موسیو رینان لکھتا ہے:۔

"(حضرت) مسیح کی تعلیم میں عملی اخلاقیات یا شرعی قوانین کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ صرف ایک مرتبہ شادی کے بارے میں آپ نے حتمی طور پر کچھ فرمایا اور طلاق کی ممانعت کی۔" (صفحہ ۲۱۳)

اسی طرح پروفیسر JOAD اپنی کتاب 'GOD AND EVIL' میں لکھتا ہے کہ "اناجیل کے باہمی تضاد نے مجھے پریشان کر دیا ہے[1]۔" میں ان کے متعلق بہت کچھ پڑھ لینے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسٹر BEVAN کا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ:۔

ہماری قدیمی اناجیل، سینٹ مرقس اور سینٹ پطرس کی یادداشتوں کا مجموعہ ہیں۔ یعنی (حضرت)

---

[1] صفحہ ۳۱۸۔

عیسیٰؑ نے پطرس کی وفات سے اڑتیس سال قبل جو کچھ کہا، اس میں سے جو کچھ پطرس کو یاد رہ سکا، وہ بھی ارامی زبان سے یونانی میں ترجمہ شدہ۔ اس لئے (کلیسا کے فیصلہ سے قطع نظر) یہ سمجھنا بالکل حماقت ہے کہ آج جو کچھ (حضرت) عیسیٰؑ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اسی طرح لفظاً لفظاً انہی کا ہے۔ گویا کسی مختصر نویس (شارٹ ہینڈ رائٹر) نے اسے لکھ لیا ہو، یا فوٹوگراف نے محفوظ کر لیا ہو"۔ (صفحہ ۳۲۳)

اناجیل کے متعلق جوڈ لکھتا ہے:-

"سیاسی اور اقتصادی معاملات کے متعلق (حضرت) عیسیٰؑ کی تعلیم افسوسناک حد تک مبہم ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسیحی علماء سرمایہ داری، استعماریت، غلامی، جنگ، قید و بند (دشمنوں کو) زندہ جلانا اور تکالیف دینا، غرضیکہ جس چیز کو چاہیں بلا دقت مسیح کی تعلیم ثابت کر سکتے ہیں"۔ (صفحہ ۳۳۱)

یہ ہے ان اناجیل اربعہ کی تاریخ تدوین۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیئے کہ جو نسخے پہلی صدی عیسوی کے اخیر تک مرتب ہوئے یا جنہیں چوتھی صدی میں نیقیہ کی کونسل نے منتخب کیا تھا، وہ اب تک موجود چلے آرہے ہیں۔ دنیا میں اناجیل کے صرف تین قدیمی نسخے ہیں۔

قدیمی نسخے

ایک ویٹیکن میں، جس کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ غالباً پانچویں یا چھٹی صدی کا ہے۔ اس نسخہ میں عہد نامۂ عتیق و جدید کی کتابیں یونانی زبان میں ہیں لیکن مکمل نہیں۔ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بائبل میں ہوں گی ہی اتنی کتابیں، جتنی اس نسخہ میں موجود ہیں۔ باقی کتابیں بعد کا اضافہ ہیں۔

دوسرا نسخہ اسکندریہ کا ہے جو آجکل برٹش میوزیم میں ہے۔ اس کے متعلق بھی خیال ہے کہ یہ پانچویں صدی سے پہلے کا نہیں۔ یہ بھی یونانی زبان میں ہے اور ناقص۔

تیسرا نسخہ سینا ہے، جو روس کے (سابقہ) پایۂ تخت پٹروگریڈ میں تھا اور جسے روسیوں نے انگلستان کے ہاتھوں فروخت کر دیا تھا۔ یہ نسخہ چوتھی صدی کا لکھا ہوا ہے۔ اس میں انجیل مرقس کا آخری باب، جس میں حضرت مسیحؑ کے آسمان پر تشریف لے جانے کا ذکر ہے موجود نہیں۔ اس لئے اب رفتہ رفتہ یہ خیال پختہ ہو رہا ہے کہ یہ قصہ بعد کا اور الحاقی ہے۔

تراجم | چوتھی صدی میں 'جیروم' نے ان اناجیل کا ترجمہ یونانی زبان سے لاطینی میں کیا۔ یہی ترجمہ اس انگریزی ترجمہ کا ماخذ ہے جو شاہ جیمس کے عہد میں (۱۶۱۱ء میں) شائع کیا گیا اور جو "مستند ترجمہ" کہلاتا ہے۔ ۱۸۷۰ء میں کنٹربری میں، ۲۷ علمائے عیسائیت کی ایک مجلس بدیں غرض منعقد ہوئی کہ چونکہ ۱۶۱۱ء والا ترجمہ ناقص ہے، اس لئے ایک مستند ترجمہ شائع کیا جائے۔ ۱۶۱۱ء کے ترجمہ کے ناقص رہ جانے کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں اناجیل کے دو قدیمی نسخے (اسکندریہ اور سینا) دریافت نہیں ہوئے تھے، نیز اس لئے کہ اثری تحقیقات نے دنیائے تاریخ میں ایک انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ اس کانفرنس نے ۱۸۸۱ء میں ایک اردو ترجمہ شائع کیا۔ جسے 'REVISED EDITION' کہا جاتا ہے۔ اس کانفرنس نے متفقہ طور پر فیصلہ کیا کہ ۱۶۱۱ء کے ترجمہ میں متعدد مقامات الحاقی ہیں۔ یہ تو ہے ان دو "مستند" ترجموں کے باہمی موازنہ کا نتیجہ، لیکن انجیل کے جو نسخے بائبل سوسائٹیز کی طرف سے شائع ہوتے رہتے ہیں، ان کی کیفیت بھی یہ ہے کہ ہر نیا ایڈیشن، سابقہ ایڈیشن سے، اور ہر نئی زبان میں ترجمہ، کسی دوسری زبان میں ترجمہ سے مختلف ہوتا ہے۔ چنانچہ جرمن ڈاکٹر میل نے جب عہدنامہ جدید کے چند نسخے جمع کر کے ان کا موازنہ کیا تو تیس ہزار اختلافات شمار کئے اور جان جیمس نے اس سے ذرا زیادہ تحقیق کی تو دس لاکھ اختلافات اُبھر کر سامنے آ گئے۔ (مزید تفصیلات کے لئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون 'GOSPEL' اور انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کا مضمون 'BIBLE' دیکھئے۔

بائبل کا مفسر پادری ڈملو، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ لکھتا ہے:-

"اناجیل کے لکھنے والوں نے یسوع مسیحؑ کے اقوال کو یونانی زبان میں لکھا ہے، حالانکہ وہ (حضرت مسیحؑ) اغلباً ارامی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ نہ ہی یہ اغلب ہے کہ ان کاتبوں کا کبھی یہ خیال تھا کہ ان کی تحریریں ابتدائی کلیساؤں سے آگے بھی جائیں گی۔ یہی حال پولوس کی تحریروں کا ہے۔ اس کے خطوط جن کی اب اس قدر عزت کی جاتی ہے، اصل میں صرف ان ہی کلیساؤں کے لئے مخصوص تھے، جن کے نام وہ لکھے گئے تھے۔ جن لوگوں نے انہیں سب سے پہلے نقل کیا، وہ ہرگز انہیں ان معنوں میں مقدس نوشتے نہیں سمجھتے تھے۔ جن معنوں میں ہم سمجھتے ہیں۔"

آگے چل کر یہی مفسر رقمطراز ہے:-

"ایک نسخہ کا نقل کرنے والا بعض اوقات وہ الفاظ درج نہیں کرتا تھا جو اصل عبارت میں موجود ہوتے تھے بلکہ وہ الفاظ درج کر دیتا جو اس کے خیال میں درج ہونے چاہیئے تھے۔ وہ ایک ناقابلِ اعتبار حافظہ

پر بھروسہ کرتا یا بعض اوقات اصل عبارت کو بدل کر اس فرقہ کے خیالات کے مطابق کر دیتا جس سے وہ خود متعلق ہوتا۔ ابتدائی عیسائی بزرگوں کی عبارات اور حوالجات کے علاوہ، عہد نامہ جدید کے قریب چار ہزار (مختلف) نسخے یونانی زبان میں ہیں۔ نتیجہ یہ کہ اختلاف عبارات بہت زیادہ ہیں۔"

ٹرنٹ کی کونسل

جس طرح چوتھی صدی عیسوی میں نیقیہ کی مشہور کونسل منعقد ہوئی تھی۔ اسی طرح سولہویں صدی (۱۵۴۵ء لغایت ۱۵۶۳ء) میں ٹرنٹ TRENT کے مقام پر ایک اور عظیم الشان کونسل منعقد ہوئی۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس کونسل میں جو اہم مباحث فیصل ہوئے تھے، ان کا اجمالی ذکر اس مقام پر کر دیا جائے۔ یہ بیان اس روئداد سے ماخوذ ہے، جسے ریلیجس ٹریکٹ سوسائٹی (لندن) نے شائع کیا تھا۔ اس کونسل میں منجملہ دیگر امور، ذیل کی تین اہم باتیں زیر بحث آئی تھیں:-

۱۔ اپوکریفہ کی حیثیت کیا ہے؟

۲۔ کیا روایات اور اناجیل ہم پلہ ہیں؟

۳۔ اناجیل کے مختلف نسخوں میں جو اختلافات ہیں، انہیں کسطرح رفع کیا جائے؟

شقِ اوّل کے متعلق اس روئداد میں مذکور ہے:-

"اگرچہ اپوکریفہ کتابوں کو جیروم نے بائبل کے ولگیٹ ایڈیشن میں شامل کر دیا تھا لیکن یہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ وہ انہیں مستند نہیں سمجھتا تھا ...... لیکن کونسل میں (بحث و تمحیص کے بعد) سینٹا کروس کی رائے سب پر غالب آ گئی، اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ ولگیٹ ایڈیشن میں جس قدر کتابیں بھی شامل ہیں، انہیں آسمانی کتابیں تصور کیا جائے۔" (صفحہ ۲۷ - ۲۸)

اس طرح اپوکریفہ کی جعلی کتابیں آسمانی قرار پا گئیں۔

شقِ دوم کے متعلق کونسل کے اراکین میں بہت اختلاف تھا۔ چنانچہ جب یہ مسئلہ بحث کے لئے پیش ہوا، اور وہ حصّہ پڑھا گیا جس میں درج تھا کہ اناجیل اور روایات کو یکساں تقدس اور عظمت کی نگاہ سے دیکھا جائے تو برٹنی نے اس کی مخالفت کی اور کہا کہ اگرچہ مجھے یہ تسلیم ہے کہ ان دونوں کا مصنف خدا ہی ہے کیونکہ سچائی جو بھی ہو، اس کا سرچشمہ وہی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو کچھ بھی سچ ہے، وہ سب الہامی ہے۔ (مزید برآں) یہ حقیقت کہ بہت سی روایات اب استعمال میں نہیں ہیں

اس امر پر دال ہے کہ خدا کا یہ قطعاً منشا نہ تھا کہ انہیں تقدس و عظمت میں اناجیل کا ہم پلہ سمجھا جائے"۔
(صفحہ ۲۹)

لیکن اس کے خلاف مخالفت کا ایسا سیلاب اٹڈا کہ اس بیچارے کو....... معافی مانگنی پڑی اور یہ وعدہ کرنا پڑا کہ جو کچھ بھی فیصلہ ہوگا، وہ اسے تسلیم کرے گا۔ چنانچہ یہی قرار پایا کہ روایات کو وحی کا ہم پایہ سمجھا جائے۔ (روایات کے متعلق یہودیوں کا مسلک اس سے پیشتر بیان ہو چکا ہے)

شق سوم کے متعلق ایک کمیٹی مقرر کی گئی، جس نے اپنی رپورٹ میں بیان کیا کہ " اس قدر مختلف نسخوں کا وجود اناجیل کے معانی کو غیر متیقن کر دیتا ہے۔ اس کا علاج صرف یہ ہے کہ ایک متفقہ علیہ نسخہ شائع کر دیا جائے، جسے مستند سمجھا جائے۔" (صفحہ ۲۹) چنانچہ یہ طے ہوا کہ چھ ارکان پر مشتمل ایک اور کمیٹی متعین کی جائے جو ولیگٹ کے مختلف نسخوں سے ایک متفقہ علیہ نسخہ مرتب کرے۔ (صفحہ ۳۰)

'PALLVICINT' کا بیان ہے کہ اس کمیٹی نے ایک طویل رپورٹ پیش کی، جس میں اغلاط و اختلافات کی ایک لمبی چوڑی فہرست درج تھی۔ " اس کثافت کے ڈھیر کو کوئی سیلاب ہی صاف کر سکتا تھا۔" (صفحہ ۳۲) اس کمیٹی نے بڑی محنت اور جانفشانی کے بعد ایک نسخہ مرتب کیا لیکن وہ پوپ کو پسند نہ آیا۔ چنانچہ اس نے یہ کام علماء کی ایک مجلس کے سپرد کیا۔ اس کے جانشین 'PIOUS V' نے بھی اس مہم کو جاری رکھا اور بالآخر ۱۵۹۰ء میں ایک نسخہ شائع ہوا۔

" اس مستقل مزاج پوپ نے نہ صرف اپنے گرد و پیش بڑے بڑے علماء اور نقّاد کی جماعت ہی جمع کی بلکہ خود بھی بڑے جذب و شوق سے اس کام میں منہمک ہو گیا۔ اس نے پریس میں بھیجنے سے پہلے اس نسخہ کو حرف بحرف خود پڑھا۔ دورانِ طباعت میں اسے دوبارہ پڑھا۔ جب چھپ کر آیا تو اسے پھر پڑھا اور اس کی تصحیح کی۔ اس کے بعد اسے مستند قرار دے کر شائع کیا گیا لیکن ابھی یہ نسخہ شائع ہوا ہی تھا کہ معلوم ہوا کہ اس میں بہت سی غلطیاں رہ گئی ہیں۔ چنانچہ اسے واپس لے لیا گیا اور ۱۵۹۲ء میں اس سے زیادہ صحیح ایک اور نسخہ شائع کیا گیا۔ ان دونوں نسخوں میں نمایاں اختلاف ہے۔ اس کے بعد ۱۵۹۳ء میں ایک اور نسخہ شائع ہوا جو ۱۵۹۲ء والے نسخہ سے بھی مختلف تھا۔ ڈاکٹر جیمس نے ان دونوں نسخوں کا مقابلہ کیا تو ان میں قریب دو ہزار اختلافات نظر پڑے۔ جن میں بعض آیات پوری کی پوری ایک دوسرے سے مختلف تھیں اور بہت سی آیات ایک دوسرے سے متضاد تھیں بایں ہمہ ان دونوں نسخوں کو یکساں طور پر مستند تصوّر کیا گیا۔" (صفحہ ۳۳۔ ۳۴)

غور فرمایا آپ نے کہ اناجیل کے "مستند" نسخے کس طرح وجود میں آتے رہے ہیں۔ یہی مستند نسخے تھے۔ جن کا انگریزی ترجمہ شاہ جیمس کے عہد میں (۱۶۱۱ء میں ہوا) اور جسے پھر ۱۸۸۱ء میں ترمیم و تنسیخ کے بعد شائع کیا گیا۔ سوچئے کہ اس آخری نسخہ کو (جو پھر ہر نئے ایڈیشن کے وقت بدلا جاتا ہے) جناب حضرت مسیحؑ کی انجیل سے کیا نسبت باقی رہ جاتی ہے؟ حال ہی میں (غالباً ۱۹۶۱ء میں) بائبل کا ایک جدید انگریزی ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔ یہ ماڈرن انگلش (جدید انگریزی زبان) میں ہے۔ سابقہ انگریزی ایڈیشنوں کی خاص زبان تھی —— جسے "بائبلی زبان" کہا جاتا تھا۔

ان اختلافات یا اغلاط کے متعلق یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ یہ دورِ حاضرہ کی پیداوار ہیں؛ تو اناجیل کی تالیف کے ساتھ ہی شروع ہو گئے تھے۔ مشہور نقاد 'CELSOS' قریب ۲۰۰ء میں لکھتا ہے کہ:

دانستہ تحریف

"عیسائیوں نے اپنی مقدس کتابوں میں دیدہ و دانستہ فریب کارانہ انداز سے ردّ و بدل کر ڈالا ہے۔"

اس تحریف و الحاق کے انداز کیا تھے؛ سب سے پہلے تو یہ کہ حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ عام طور پر ناخواندہ تھے۔ چنانچہ مشہور عیسائی مؤرخ 'MOSHEIM' جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ اپنی تاریخ کے حصۂ اول (پہلی صدی) باب ۴/۴ میں لکھتا ہے:-

"یہ تمام شاگرد تعلیم سے بے بہرہ اور فلسفہ اور دیگر علوم سے ناآشنا تھے۔"

اس سے ظاہر ہے کہ اناجیل کے اصل نسخے ان کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ (اس سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ موجودہ نسخے جو ان حواریوں کی طرف منسوب کئے جاتے ہیں، دراصل ان کی تالیف نہیں ہیں کیونکہ وہ تو تعلیم سے بے بہرہ تھے)۔ لیکن اس تحریف اور تغیّر و تبدّل کی اس سے کہیں گہری وجہ ایک اور تھی۔ یہ وجہ کیا تھی؟ اسے غور سے سنئے! سینٹ پال (موجودہ عیسائیت کا بانی) انجیل (خطوط پال) میں لکھتا ہے:

"اگر میرے جھوٹ کے سبب سے، خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے؟" (رومیوں کے نام ۷/۳)

جھوٹ کی "عظمت"

غور فرمایا آپ نے کہ یہ کیا عقیدہ ہے؟ اگر جھوٹ بولنے سے "خدا کی بڑائی" ظاہر ہوتی ہو تو بلا تکلف جھوٹ بولئے۔ جب جھوٹ کا دروازہ اس طرح چوپٹ کھول دیا جائے تو اس سے جو نتائج پیدا ہوں گے، ظاہر ہیں۔ 'MOSHEIM' چوتھی صدی کے متعلق لکھتا ہے:-

"مذہبی صداقت اور پاکبازی کو ان دو خطرناک حماقتوں سے سخت ٹھیس لگی جو اس صدی میں عام طور پر مروّج ہو چکی تھیں۔ اوّل یہ عقیدہ کہ اگر جھوٹ بولنے اور دھوکا دینے سے کلیسا کے مفاد کو تقویت پہنچتی ہو تو یہ کذب و فریب بڑے ثواب کا درجہ رکھتا ہے۔

...... یہ عقیدہ ایک عرصہ سے مروّج چلا آتا تھا اور اس نے اس اثناء میں بے شمار مضحکہ انگیز روایات، افسانہ طرازیاں اور مقدس فریب (عیسائیت میں داخل کر کے) رکھ دیے۔ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کھلے بندوں کر لینا ہو گا کہ اس صدی (چوتھی صدی) میں بڑی بڑی جلیل القدر ہستیاں اور بڑے بڑے مقدس ولی بھی اس دروغ بافی اور کذب تراشی سے بری نہ تھے اور اس کا ثبوت ان کی تحریروں سے اور ان کے کارناموں سے بآسانی مل سکتا ہے۔ ہمارا جی چاہتا ہے کہ اس الزام سے کم از کم بڑی بڑی مقدس ہستیوں (مثل فلاں اور فلاں) کو تو مستثنیٰ قرار دے دیں لیکن کیا کیا جائے! سچائی ان بزرگوں کی عقیدت سے کہیں زیادہ قابلِ احترام ہے اور سچائی کا تقاضا ہے کہ انہیں بھی اس الزام کا مورد قرار دیا جائے۔" (چوتھی صدی، حصہ دوم، باب ۳/۱۶)

یہی مؤرخ تیسری صدی کے متعلق لکھتا ہے:-

"جو لوگ یہ چاہتے تھے کہ نیکیوں میں دوسروں سے سبقت لے جائیں، وہ اس چیز کو نہ صرف جائز ہی سمجھتے تھے بلکہ قابلِ تحسین بھی کہ نیکی کے مشن کو تصنّع اور فریب سے تقویت دی جائے۔"

(حصہ دوم، باب ۳/۱۱)

اسے نظر انداز نہ کیجئے کہ لکھنے والا کوئی غیر عیسائی نہیں بلکہ عیسائیوں کی دنیا کا ایک بہت بڑا مؤرخ ہے، جس کی تاریخ کلیسا ایک مستند صحیفہ سمجھی جاتی ہے۔ اوپر چوتھی اور تیسری صدی کا ذکر آ چکا ہے۔ اب دوسری صدی کو لیجئے:-

فلاطونی اور فیثاغورثی مسلک کے پیرو، صداقت اور نیکی کے مشن کو، جھوٹ اور فریب سے فروغ دینے کو نہ صرف جائز بلکہ قابلِ ستائش خیال کرتے تھے۔ جو یہودی مصر میں رہتے تھے، انہوں نے (حضرت) مسیحؑ سے پیشتر ان لوگوں سے یہ اصول مستعار لے رکھے تھے، جیسا کہ ازمنۂ قدیمہ کی بیشمار دستاویزات سے صاف طور پر ثابت ہے۔ عیسائیوں نے اس اصول کو ان دونوں سرچشموں سے حاصل کیا۔ جیسا کہ ان کثیر التعداد کتابوں سے ظاہر ہے، جنہیں تصنیف کسی نے کیا اور منسوب کسی اور کی طرف ہیں۔" (حصہ دوم، باب ۳/۱۵)

اس سے بھی پیچھے چلیئے اور پہلی صدی کی حالت دیکھئے:۔

"(حضرت) مسیحؑ کے آسمان پر تشریف لے جانے کے تھوڑا عرصہ بعد، آپ کی زندگی اور تعلیم کے متعلق بہت سی سیرت کی کتابیں لکھی گئیں جو مقدس فریبیوں اور اعجوبہ نگاریوں سے بھرپور تھیں۔ یہ کتابیں ان لوگوں نے تصنیف کیں، جن کی شاید نیت تو خراب نہ تھی لیکن ان کی تحریروں سے سخت اوہام پرستی اور جہالت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ یہیں پر بس نہیں، بہت سے فریب کاروں نے خود کتابیں لکھیں اور انہیں مقدس حواریوں کی طرف منسوب کر کے دنیا کے حوالے کر دیا[1]۔"

(پہلی صدی، حصہ دوم، باب ۱۷/۲)

اندازہ فرمائیے کہ اس "مقدس جھوٹ" نے جسے سینٹ پال نے بہت بڑا کار ثواب قرار دیا تھا، کیا کیا گل کھلائے۔ اور یہ سلسلہ پہلی صدی ہی سے شروع ہو گیا۔ مندرجہ صدر اقتباسات صرف پہلی چار صدیوں کے متعلق ہیں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کا اندازہ اسی سے لگا لیجئے۔ ان ہی حقائق کے پیشِ نظر خود عیسائیوں کے علماء اب اس امر کا اعلانیہ اعتراف کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں کہ اناجیل ناقابلِ اعتبار ہیں۔ انگلیکن چرچ کا بشپ 'CHARLES GORE' لکھتا ہے:۔

"سینٹ کرو سٹم کی طرح میرے لئے بھی اس امر کا تسلیم کرنا ناممکن ہے کہ اناجیل غلطی سے مبرا ہیں:"

(THE HOLY SPIRIT AND THE CHURCH)

یہ ہے اناجیل کی داستان۔ اب آپ خود فیصلہ فرمائیے کہ اس مجموعہ کو کس طرح الہامی اور آسمانی قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان تصرفات سے صرف یہی نہیں ہوا کہ تاریخی حقائق افسانوں میں بدل گئے بلکہ مذہب نے ایک ایسی صورت اختیار کر لی، جسے کسی طرح بھی ایک مامور من اللہ، خدا کے رسول کی اصلی تعلیم قرار نہیں دیا جا سکتا۔ مذہب کا مدار ہے عقائد اور اعمال صالحہ پر، عقائد کے بارے میں، جیسا کہ آپ پہلے دیکھ چکے ہیں، عیسائیت کی بناء تثلیث قرار پا گئی اور اعمال کی جگہ کفارہ کے عقیدہ نے لے لی۔ جس

عیسائیوں کے عقائد

---

[1] کم و بیش پچاس انجیلیں آج بھی ایسی موجود ہیں، جنہیں اپوکریفہ کی فہرست میں داخل کیا جاتا ہے۔ لیکن جن کتابوں کو اصل سمجھ کر مقدس آسمانی خیال کیا جاتا ہے، ان کی اصلیت کے متعلق بھی آپ گذشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

کی رُو سے نجات کا مدار، اعمال کے بجائے حضرت عیسیٰؑ کی تصلیب کا عقیدہ قرار پا گیا۔ عقیدہ کی رُو سے عیسائیوں کے اصول مذہب یہ ہیں۔

"ہم ایمان لائے۔ (۱) خدا، قدرت والے باپ پر، جو ظاہر اور پوشیدہ چیزوں کا خالق ہے اور (۲) ربِ یسوع مسیح ابن اللہ پر جو باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ جو باپ (خدا) کے ہاں جملہ کائنات سے پہلے پیدا ہوا۔ عین ذات ہے الاٰلہٰ ہے، نور نور ہے۔ عین خدا ہے۔ مولود مولود ہے مخلوق نہیں۔ باپ اور اس کا جوہر ایک ہے۔ اس کی وساطت سے تخلیق اشیاء ظہور میں آئیں یعنی جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے۔ ہم انسانوں کی نجات کے واسطے اس کا نزول و حلول ہوا اور وہ انسان بن کر آیا۔ مبتلائے بلا ہوا اور تیسرے دن اٹھ کھڑا ہوا اور آسمان پر چڑھ گیا، اور اب زندوں اور مردوں کا انصاف کرنے پھر آئے گا۔" (COUNCIL OF TRENT_P.161)

'LESLIE PAUL' جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ لکھتا ہے:۔

"مادہ اور کائنات کی تخلیق و تعمیر کے متعلق عیسائیت کے نظریئے غلط ہو سکتے ہیں لیکن خدا کے متعلق تصور اور اس کے متعلق اس کی تعلیم غلط نہیں ہو سکتی۔" (THE ANNIHILATION OF MAN_P.175)

یعنی دنیائے علم میں اناجیل کے بیان کردہ حقائق، عصرِ حاضر کے انکشافات و تحقیقات کے پیشِ نظر مسترد کئے جا سکتے ہیں لیکن خدا کے متعلق اس کی تعلیم ناقابلِ تردید ہے لیکن ایک دوسرا عیسائی محقق 'SIR RICHARD GREGORY' خدا کے متعلق اناجیل کی تعلیم کے بارے میں جس کا نتیجہ پر پہنچا ہے۔ وہ قابلِ غور ہے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"بائبل میں خدا کا تصور یکساں نہیں (کہیں کچھ ہے اور کہیں کچھ) اور یہ یقین کے ساتھ بتایا جا سکتا ہے کہ فلاں مقام پر کون غیر مسیحی اثر کارفرما ہے اور فلاں مقام پر کون؟"
(RELIGION IN SCIENCE AND CIVILISATION-P.87)

لیجئے! خدا کے متعلق تعلیم، جسے پال نے قابلِ اعتنا بتایا ہے، وہ مزید تحقیق کے مطابق یکسر خارجی اثرات کا مجموعہ بن کر سامنے آ گئی۔ اسی بناء پر GREGORY لکھتا ہے کہ:۔

"بائبل حسبِ ذیل وجوہ کی بناء پر اپنی صحت کے عقیدہ کو ثابت کرنے میں ناکام رہ جاتی ہے۔

۱۔ اس کا خود باہمی تضاد۔

۲۔ مذہبِ عیسائیت کی بنیاد کن چیزوں پر ہونی چاہیئے اور اخلاق کا ضابطہ کیا ہے۔ اس کے متعلق جو

نظریے آجکل مروج ہیں، ان سے بائیبل کا اختلاف ہے۔
(۳) جو واقعات اس میں بیان کئے گئے ہیں، سائنس کے موجودہ انکشافات ان کی تغلیط کر رہے ہیں۔
(۴) اس کی تدوین و تالیف اور جمع و تدوین کے متعلق جو کچھ عقیدہ پیش کیا جاتا ہے، جب اسے تنقید کی کسوٹی پر پرکھا جائے، وہ بالکل باطل نظر آتا ہے۔ اس لئے جب اس کی بنیادیں ہی غلط ثابت ہوتی ہوں تو اس کی صحت کیسے تسلیم کی جا سکتی ہے۔" (صـ۸۲ـ)

کفارہ کے عقیدہ کا بانی اور مبلغ سینٹ پال ہے۔ عہد نامۂ جدید میں پولوس (سینٹ پال) کے خطوط پڑھئے، ہر جگہ اسی عقیدہ کی تبلیغ دکھائی دے گی:۔

"تم کو ایمان کے وسیلہ ہی سے نجات ملی ہے اور یہ تمہاری طرف سے نہیں۔ خدا کی بخشش ہے اور نہ اعمال کے سبب سے ہے۔" (افسیون ۹-۸/۲)

اور یہ کہ:۔

"چنانچہ ہم یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ انسان، شریعت کے اعمال کے بغیر ایمان کے سبب سے راست باز ٹھہرتا ہے۔" (رومیوں کے نام۔ ۳/۲۸)

اسی عقیدہ نے رفتہ رفتہ معافی ناموں (INDULGENCES) کی صورت اختیار کر لی۔ ان کی ابتدا یوں ہوئی کہ صلیبی جنگوں کے دوران میں پوپ اربن دوم (URBAN-II) نے حکم جاری کیا کہ جو لوگ بذاتِ خویش شریکِ جنگ نہیں ہو سکتے، وہ اپنی طرف سے کسی اور کو بھیج دیں اور اس کے بدلے میں انہیں "معافی نامہ" دے دیا جائے گا، جو ان کی نجات کا کفیل ہوگا۔ جب پوپ لیو دہم (LEO-X) نے روما میں سینٹ پیٹر کا گرجا بنوانا چاہا تو اس نے بھی اسی قسم .... "معافی نامے" بیچنے شروع کر دیے۔ بس پھر کیا تھا؛ ان معافی ناموں نے عام تجارت کی صورت اختیار کر لی۔ قریہ بہ قریہ، کو بہ کو، ہر مقام پر ان معافی ناموں کی ایجنسیاں قائم ہو گئیں۔ سولھویں صدی عیسوی میں اس تجارت نے ایک طوفانی صورت اختیار کر لی۔ ہر گناہ کی معافی کے لئے الگ الگ قیمت کا "معافی نامہ" موجود تھا۔ آپ (BUCK'S THEOLOGICAL DICTIONARY) اٹھائیے اور اس میں 'INDULGENCES' کے زیر عنوان دیکھئے کہ کیسی عجیب و غریب منڈی کا نقشہ نظر آتا ہے۔ معافی نامہ کی عام فارم یہ ہوا کرتی تھی:۔

معافی نامے

"تم پر خداوند یسوع مسیح کی رحمت ہو اور وہ تمہیں اپنے مقدس ترحم (خسروانہ) سے (تمام گناہوں کی پاداش سے) آزاد کردے۔ میں اس کی اور اس کے بابرکت شاگرد پطرس، پولوس اور مقدس پوپ کی اس سند کی رُو سے جو مجھے انہوں نے عطا فرمائی ہے، تمہیں آزاد کرتا ہوں۔ سب سے پہلے کلیسا کی تمام ملامتوں سے، خواہ وہ کسی شکل میں ہوں۔ پھر تمہارے ہر گناہ، حدود شکنی اور زیادتی سے خواہ وہ کیسے ہی مہیب اور شدید کیوں نہ ہوں اور میں وہ سزا تم سے اُٹھا لیتا ہوں، جو تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں جہنم میں ملنے والی تھی تاکہ تم جب مرو تو جہنم کے دروازے تم پر بند ہوں اور جنت کی راہیں کشادہ۔ باپ بیٹے اور روح القدس کے نام پر۔"

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، ان معافی ناموں کے لئے مختلف گناہوں کی قیمتیں الگ الگ ہوتی تھیں اور ہر ایجنٹ کے پاس ان کی فہرست موجود ہوتی تھی۔ جس کی اصل TAX OF THE SACRED ROMAN CHANCERY کی کتاب میں مصدقہ طور پر محفوظ ہوئی تھی۔ چند ایک گناہوں کی معافی کی قیمتیں ملاحظہ فرمائیے:۔

۱۔	اسقاطِ حمل	۶ پینس ۔	۳ شلنگ
۲۔	عدالت میں جھوٹی قسم	۰ پینس	۹ شلنگ
۳۔	چوری	۰ پینس	۱۲ شلنگ
۴۔	کسی عفیفہ کی عصمت دری	۰ //	۹ //
۵۔	زنا کی اور بھیانک صورتوں میں	۶ //	۷ //
۶۔	قتل	۶ //	۷ //
۷۔	لونڈی رکھنے کے لئے	۶ //	۱۰ //

یہ معافی نامے نہ صرف اپنے گناہوں کی بخشش کے لئے خریدے جاتے تھے بلکہ مردوں کے گناہوں کے لئے بطور کفارہ بھی خریدے جا سکتے تھے۔ چنانچہ ان معافی ناموں کے ایجنٹ کچھ اس قسم کی آوازیں لگایا کرتے تھے:۔

"آؤ بڑھو! جنت کے دروازے کھل رہے ہیں۔ اگر تم اب بھی داخل نہ ہوگے تو کب داخل ہوگے۔ تم بارہ پنس کے عوض اپنے باپ کی روح کو جہنم سے نکلوا سکتے ہو۔ کیا تم ایسے ناخلف ہو کہ اپنے باپ کے لئے اس قدر سستی نجات بھی نہیں خرید سکتے؟ اگر تمہارے پاس اور کچھ نہیں فقط ایک کوٹ ہے تو وہی اتار دو تاکہ اس قدر گراں بہا متاع خرید سکو۔"[ط] BUCK'S DICTIONARY

ط فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر دیکھئے۔

آکسفورڈ کا چانسلر 'THOMAS GASCUIGNE' ۱۴۵۰ء میں لکھتا ہے:۔

"آجکل گناہ گار (ہر جگہ) یہ کہتے ہوئے سنائی دے رہے ہیں کہ " میں اس کی کوئی پرواہ نہیں کرتا کہ میں خدا کے حضور کتنے گناہ کرتا ہوں۔ اس لئے کہ میں ہر وقت بلا دقت ہر گناہ اور جرم کے لئے معافی نامہ خرید سکتا ہوں۔ کبھی چار پنس میں، کبھی جوئے کے ایک داؤ کی قیمت کے بدلے ـــ" اس لئے کہ ان معافی ناموں کے بیچنے والے ہر جگہ دکھائی دے رہے ہیں اور وہ انہیں کبھی دو دو پنس میں کبھی ایک جام شراب کے بدلے یا جوئے میں ہاری ہوئی رقم کے معاوضہ میں اور گاہے کسی رنڈی کے خرچہ کے عوض میں بیچ دیتے ہیں۔"

QUOTED BY MENCKEN IN TREATISE ON RIGHT AND WRONG PP. 187-188)

یہ خرابیاں صرف بازاری لوگوں تک محدود نہ تھیں بلکہ نظامِ کلیسا کی بنیاد میں داخل تھیں۔ چنانچہ اس باب میں DR. INGE جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، لکھتا ہے:۔

جس عہد میں کلیسا، سیاسی طور پر صاحب اقتدار رہا، وہی عہد سب سے زیادہ بدمعاشیوں کے لئے

ص ۵۰ کا فٹ نوٹ

کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی خرابیاں اس وقت پیدا ہو جاتی ہیں، جب مذہب اپنے مرکزِ ثقل سے ہٹ جاتا ہے اور اس میں یہودیت اور عیسائیت کی کوئی خصوصیت نہیں، سب کے ہاں یہی کچھ ہوتا ہے۔ یہ ہمیں تسلیم اور اس حقیقت کا اعتراف بھی کہ خود مسلمانوں کے ہاں بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہو گئیں لیکن ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے ہاں یہ تمام خرابیاں اس تعلیم کی بنا پر پیدا ہوئیں جو آج بھی ان کتابوں میں موجود ہے، جنہیں وہ الہامی قرار دیتے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمانوں کے ہاں جسقدر عملی اور اعتقادی خرابیاں پیدا ہوئیں، ان سب کی کھلی کھلی تردید ان کی آسمانی کتاب میں موجود ہے۔ جسے قرآنِ کریم کہتے ہیں۔ قرآن کے علاوہ ان کے ہاں اور کوئی تعلیم وحی پر مبنی نہیں (جیسے یہودیوں کے ہاں وحیِ غیر مکتوب' یعنی مجموعہ روایات اور عیسائیوں کے ہاں "رسولوں کے اعمال" اور "حواریوں کے خطوط و مکاشفات" بھی الہامی صحیفے قرار دیے جاتے ہیں) اور ہر وہ تعلیم جو قرآن کے خلاف ہو، بلا تأمل ٹھکرا دینے کے قابل ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے ہاں ہر وقت بتایا جا سکتا ہے کہ فلاں فلاں چیز آسمانی تعلیم کے خلاف ہے۔ برعکس اس کے عیسائیوں اور یہودیوں میں ایسا نہیں بتایا جا سکتا کیونکہ یہ غلط تعلیم خود ان کے ان مقدس نوشتوں میں شامل ہے، جسے وہ آسمانی قرار دیتے ہیں۔

بدنام رہا۔ (صفحہ ۲۹۰)

اسی کو 'MENCKEN' ان الفاظ میں دہراتا ہے:۔

یونیورسل چرچ کے اقتدار کا زمانہ درحقیقت بے مثال جرائم و بدنظمی، ظلم و تعدی اور فسادات اور بدکاریوں کا زمانہ تھا"۔ (صفحہ ۱۰۵)

اعمال و اعتقادات کی دنیا میں بھی قیامت خیزیاں تھیں جن سے متاثر ہو کر لوتھر نے پراٹسٹنٹ کے اصلاح یافتہ فرقہ کی بنیاد رکھی لیکن اس کی تنقید محض عقل کی بنا پر تھی۔ اس لئے کہ وحی کی سچی تعلیم تو ان کے ہاں کہیں موجود ہی نہ تھی۔ جس کی روشنی میں وہ اپنے فرقہ کی عمارت آسمانی خطوط پر تعمیر کر سکتا۔ اناجیل ان کے ہاں بھی وہی ہیں جو دوسروں کے ہاں ہیں۔

عیسائیوں کے فرقے

اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ عیسائیوں میں پہلی مرتبہ یہ الگ فرقہ پیدا ہوا۔ ان کے ہاں ابتدائی ایام میں ہی بےشمار فرقے پیدا ہو گئے تھے جو ایک دوسرے سے (بنیادی عقائد تک میں) اس قدر مختلف تھے کہ کوئی دیکھنے والا انہیں ایک ہی درخت کی شاخیں قرار نہیں دے سکتا تھا۔ ایک فرقہ مارکیونی (MORCIONIST) اپنے بانی 'MORCION' کے نام سے مشہور تھا جو حضرت عیسیٰؑ کی خارق عادات پیدائش، الوہیت اور مرکر جی اٹھنے کا قائل نہ تھا۔ ابیانی فرقہ بھی حضرت عیسیٰؑ کو (حضرت) مریم اور یوسف کا بیٹا مانتا تھا لیکن اس کے ساتھ ہی ان کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ صلیب کے وقت "مسیح"، جسم مسیح سے الگ ہو کر آسمان کی طرف صعود کر گیا اور جو کچھ تکلیف پہنچی، وہ محض جسم کو پہنچی۔ یہ لوگ سینٹ پال سے سخت نفرت کرتے تھے۔ مینز 'MANES' نے ایک اور فرقہ کی بنیاد رکھی۔ جس کا عقیدہ تھا کہ مسیح وہی عقلِ کلؑ تھا جسے مذہبِ زرتشت والے مترا کہتے ہیں۔ (اس کی تفصیل آگے چل کر آئے گی) اس کا مسکن سورج تھا۔ وہ جسم ناسوت میں ظاہر ہوا لیکن یہودیوں کے ناز یبا سلوک کی وجہ سے پھر سورج میں جا بیٹھا ـــــ ناسٹک 'GNOSTIC' فرقہ ان سب سے زیادہ مشہور تھا۔ اس لفظ کے معنی دانا کے ہیں۔ ان پر فیثا غورث اور افلاطون کے فلسفہ کا بہت گہرا اثر تھا نیز زرتشت کی تعلیم کا بھی۔ یہ بھی سینٹ پال کے منکر تھے اور مسیح کو روح محض تسلیم کرتے تھے۔ تورات کی صرف پہلی پانچ کتابوں کو مانتے تھے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی رکھتے تھے کہ تمام انبیائے بنی اسرائیل (معاذ اللہ)

ؑ عیسائیت کے فلسفہ کی بنیاد ہی 'LOGOS' کے نظریہ پر ہے جو یونانیوں سے مستعار لیا گیا ہے۔

گنہگار تھے۔

ہم نے صرف برسبیلِ تذکرہ، ان فرقوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو بنیادی عقائد میں ایک دوسرے سے مختلف تھے ورنہ فرقے بے شمار تھے اور ایک ایک فرقے کی بے شمار شاخیں۔ "گبن" صرف ایک فرقہ (ناسٹک) کی پچاس شاخیں بتاتا ہے لیکن یہ تمام فرقے پانچویں صدی کے آغاز تک قریب قریب ختم ہو گئے اور فرقۂ تثلیثیہ باقی رہ گیا۔ اس کی دو بڑی شاخیں اب مذہبِ عیسائیت کی مظہر ہیں۔ مغربی کلیسا کے متبع (رومن کیتھولک اور پراٹسٹنٹ) اور مشرقی کلیسا کے پیرو، جن میں چودہ مختلف کلیسا شامل ہیں۔ ان میں پراٹسٹنٹ کچھ ترقی پسند واقع ہوئے ہیں۔ چنانچہ ان کی شائع کردہ اناجیل میں زمانہ کے حسبِ حال ساتھ کے ساتھ تغیّر و تبدّل ہوتا رہتا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے انگلستان کے سب سے بڑے لاٹ پادری لارڈ بشپ آف کنٹربری نے ایک تحقیقاتی کمیشن بٹھایا تھا کہ وہ رپورٹ کرے کہ موجودہ اناجیل میں کس قسم کا تغیّر و تبدّل کیا جائے تاکہ علومِ جدیدہ کی روشنی میں مذہب پر اعتراضات نہ ہو سکیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی رپورٹ میں منجملہ دیگر امور، الوہیتِ مسیح، ابنیت اور کفّارہ کے عقائد کی بھی سفارش کی تھی۔ ممکن ہے کہ کچھ عرصہ بعد جو اناجیل دنیا میں رائج ہوں۔ ان میں یہ عقائد باقی نہ رہیں۔

نگہِ بازگشت

یہ ہے اناجیلِ اربعہ وغیرہ (عہد نامۂ جدید) کی روئداد، جس پر مذہبِ عیسائیت کی عمارت قائم ہے۔ آگے بڑھنے سے پیشتر ایک مرتبہ پھر نگہِ بازگشت سے دیکھتے جائیے کہ اس باب میں کیا چیزیں سامنے آئی ہیں۔ ہم نے دیکھا یہ ہے کہ:۔

۱۔ حضرت عیسیٰؑ جو انجیل اپنے حواریوں کو دے کر گئے تھے۔ اس کا تاریخ میں آج کہیں سراغ نہیں ملتا۔

۲۔ دوسری صدی میں قریب (۳۴) اناجیل اور (۱۱۳) خطوط رائج تھے لیکن یہ سب یونانی زبان میں تھے، حالانکہ حضرت مسیحؑ اور ان کے حواریوں کی زبان ارامی تھی۔

۳۔ نیقیہ کی کونسل (منعقدہ ۳۲۵ء) نے عجیب و غریب طریق سے ان تمام اناجیل و خطوط سے موجودہ چار اناجیل اور کچھ اور لٹریچر منتخب کر لیا۔ (جو آج عہد نامہ جدید کہلاتا ہے) اور باقی کتابوں کو وضعی قرار دے دیا۔

۴۔ لیکن آج دنیا میں نہ اصل نسخے موجود ہیں اور نہ ہی وہ جو نیقیہ کی کونسل نے منتخب کئے تھے۔ آج دنیا میں قدیم ترین تین نسخے ہیں اور یہ چوتھی اور پانچویں صدی کے ہیں۔ یہ یونانی زبان میں ہیں اور ناقص ہیں۔

۵۔ جو چار کتبِ اناجیل موجودہ عہد نامۂ جدید کے مجموعہ میں شامل ہیں، ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ متی کی انجیل ۶۱ء اور ۱۰۰ء کے درمیان تصنیف ہوئی۔ مرقس کی انجیل ۶۴ء اور لوقا اور یوحنا کی انجیل پہلی صدی کے اخیر میں۔

۶۔ یہ اناجیل حضرت عیسیٰؑ کی سوانح حیات ہیں، جن میں پیدائش سے پہلے اور تشریف براری کے بعد تک کے حالات لکھے ہیں لیکن ان میں بھی ربط اور نظم کی نمایاں کمی ہے۔

۷۔ چوتھی صدی میں جیروم نے ان اناجیل کا لاطینی میں ترجمہ کیا۔ اس لاطینی ترجمہ سے ۱۶۱۱ء میں انگریزی میں ترجمہ ہوا لیکن ۱۸۷۰ء میں عیسائی علماء کی ایک جماعت نے اس ترجمہ کو ناقص قرار دے کر ایک اور ترجمہ شائع کیا۔ یہی ترجمہ اب بائبل (عہد نامہ جدید) کہلاتا ہے۔ اس ترجمہ کے ہر نئے ایڈیشن اور ہر نئی زبان کے ترجمہ میں بھی کچھ نہ کچھ فرق ہوتا رہتا ہے۔

۸۔ چونکہ یہ اصول مذہب عیسائیت کی بنیادی تعلیم میں داخل ہے (اور ان کی بائیبل میں موجود) کہ مذہب کے فروغ کے لئے جھوٹ بولنا کارِ ثواب ہے، اس لئے پہلی صدی سے ہی الحاق وکتمان، تغیر و تبدل، حک و اضافہ اور تلبیس و تحریف کا کام شروع ہو گیا تھا۔ اس لئے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کتابوں میں کیا چیز کس کی ہے؟

۹۔ پھر ان کتابوں میں جو تعلیم ملتی ہے، وہ تو کسی طرح بھی خدا کے ایک رسولؐ کی اصلی تعلیم قرار نہیں دی جا سکتی۔ کھلا ہوا شرک، یعنی تثلیث کا عقیدہ، الوہیت اور ابنیت کی تعلیم۔ کفارہ کا مسلک اور اس کے علاوہ وہ کچھ جو صرف ان کتابوں کے مطالعہ سے ہی معلوم ہو سکتا ہے اور تو اور اناجیل خود حضرت عیسیٰؑ کی جو تصویر پیش کرتی ہیں وہ بھی خدا کے اس عظیم المرتبت رسولؐ کے شایانِ شان نہیں۔ ڈاکٹر جوڈ، اناجیل کے باہمی اختلافات کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے:۔

"لیکن جو چیز (اس سے بھی زیادہ) افسوسناک ہے، وہ (حضرت) عیسیٰؑ کا وہ کیریکٹر ہے جو اناجیل پیش کرتی ہیں"۔ (GOD AND EVIL - P.319)

اس کے بعد ڈاکٹر جوڈ نے مثالیں پیش کی ہیں، جن کی رو سے حضرت عیسیٰؑ کی زندگی (جو اناجیل نے پیش کی ہے۔) خود ان کی اپنی تعلیم کے خلاف جاتی ہے۔ چنانچہ وہ اخیر میں لکھتا ہے کہ مسٹر CLAUDE MONTEFORE نے صحیح لکھا ہے کہ:۔

"جی چاہتا ہے کہ (پیار اور محبت کی تعلیم دینے والے مسیح) کی زندگی میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا مل جاتا جس سے ثابت ہوتا کہ انہوں نے اپنے مخالفوں اور دشمنوں سے کہیں بھی پیار اور محبت کا سلوک کیا تھا"۔ (صفحہ ۳۲۱)

تکملہ

دربارۂ تورات و انجیل

جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے ۱۹۶۳ء میں جیوئش پبلیکیشنز. سوسائٹی اوف امریکہ کی طرف سے عہد نامۂ عتیق (کی کتاب اوّل) کا جدید انگریزی ایڈیشن شائع ہؤا ہے. اس میں متعدد مقامات پر، سابقہ ایڈیشنوں سے اختلاف کیا ہے اور اس جدید تحقیق کو نمایاں طور پر پیش کیا گیا ہے کہ تورات میں جو کہا گیا ہے کہ حضرت موسےٰؑ نے بحیرۂ احمر کو عبور کیا تھا، وہ صحیح نہیں. انہوں نے نہر سویز کے قریب سے 'اس مقام سے عبور کیا تھا، جو پانی کے ہٹ جانے سے ودلدل بن چکا تھا اور جسے SEA OF REEDS کہا جاتا ہے. یہ اختلافات پہلی جلد میں ہیں. اس کے بعد بقایا جلدوں میں (جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ ان کی تکمیل میں بارہ برس کا عرصہ لگے گا) نہ معلوم اور کس قدر اختلافات ہوں گے.

۲۔ عہد نامہ جدید (انجیل) کا نیا ترجمہ (جدید انگریزی میں) حال ہی میں شائع ہوا ہے. اس میں اور سابقہ ترجمہ میں جسے KING JAMES VERSION کہا جاتا ہے، کافی فرق ہے.

۳۔ بائبل میں بڑی تفصیل سے لکھا ہؤا ہے کہ یہودیوں نے کس طرح سازش کر کے، حضرت مسیحؑ کو صلیب پر لٹکوا دیا. عیسائیت کا پورا لٹریچر اور تاریخ، اس سازش کی تفاصیل پیش کرتی ہے. دو ہزار سال سے یہ حقیقت ایک مسلّمہ کی طرح مانی جاتی رہی ہے. اب سیاسی مصالح کا تقاضا ہؤا کہ یہودیوں کے ساتھ عیسائی مملکتوں کے تعلقات خوشگوار ہوں. اس کے لئے یہ ضروری سمجھا گیا کہ یہودیوں کو اس الزام سے بری قرار دیا جائے (کہ وہ حضرت مسیحؑ کی تصلیب کے ذمہ دار ہیں) اس کے لئے حال ہی میں پوپ نے اپنی کونسل کے مشورہ سے اعلان کیا ہے کہ آئندہ یہودیوں کو اس الزام سے بری سمجھا جائے؛ انہوں نے اس بارے میں کچھ نہیں کیا تھا. اس اعلان کے بعد آپ سوچ لیجئے کہ انہیں بائبل اور اپنے دیگر لٹریچر میں کس قدر بنیادی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی.

یہ ہے کیفیت ان کی اس کتاب کی ثقاہت کی، جسے یہ حضرات خدا کی آسمانی کتاب قرار دیتے ہیں۔

اس اضافہ کو یہودیت اور عیسائیت کے (سابقہ) عنوانات کا تکملہ سمجھا جائے۔

(سنہ ۱۹۶۵ء)

باب سوم

مذہب زرتشت

۳

تورات اور انجیل ان انبیائے کرامؑ کی طرف منسوب ہیں جو سامی النسل (بلکہ بنی اسرائیل) سے متعلق تھے۔ اب ہم اس دائرہ سے باہر نکل کر دیگر مذاہب کی مبینہ آسمانی کتابوں کی طرف آتے ہیں۔ سب سے پہلے مذہب زرتشت کو لیجئے۔

اس مذہب کو ایک وقت میں دنیا میں بڑی اہمیت حاصل تھی۔[1]

جنابِ زرتشت

لیکن بایں ہمہ، جناب زرتشت کے متعلق صحیح تاریخی معلومات دنیا کے کسی گوشے میں نہیں ملتیں۔ آپ کی سوانح حیات تو ایک طرف، آپ کے زمانہ تک کے متعلق بھی ابھی تک یقینی طور پر کچھ طے نہیں ہو سکا۔ جو کچھ اس وقت تک معلوم ہو سکا ہے، اس میں اس قدر باہمی تضاد و تناقص ہے کہ حقیقت یکسر افسانوں کی چادروں میں لپٹی ہوئی مستور ہے۔

قدیمی تحریروں میں سب سے پہلے جناب زرتشت 'ZOROASTER' کا ذکر افلاطون کے ہاں ملتا ہے۔ جو ۴۰۰ء ق۔م کے قریب لکھتا ہے:-

ایرانی نوجوانوں کو مغ زرتشت ابن ہرمز تعلیم دیا کرتا تھا۔

اس سے قریب پچاس سال پیشتر، مشہور مؤرخ ہیروڈوٹس 'HERODOTUS' ایرانی پجاریوں (مغوں) کا ذکر کرتا ہے۔ DR. PRIDEU کی تحقیق کے مطابق جنابِ زرتشت، دارا (شاہِ ایران) کے ہم عصر تھے۔ ان تحقیقات کی روشنی میں عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ جنابِ زرتشت کا زمانہ ۶۰۰ء ق۔م سے پہلے کا نہیں لیکن گبن لکھتا ہے کہ:-

---

[1] ہمارے ہاں یہ مذہب مجوس، پارسیوں کے مذہب کی حیثیت سے متعارف ہے۔ جنہیں آتش پرست بھی کہا جاتا ہے۔ پارسی اب سمٹ سمٹا کر بمبئی کے ساحل پر مرکوز ہو چکے ہیں۔

" دارا کے ہمعصر یونانی مورخوں کی رائے کے مطابق (جناب) زرتشت کا زمانہ، دارا سے سینکڑوں بلکہ ہزاروں سال پہلے کا ہے"؟

انیسویں صدی میں ہاگ 'HAUG' اور بنسن BUNSEN وغیرہ نے مزید تحقیق کی اور ژند اوستا کا ترجمہ بھی کیا۔ ان کا خیال ہے کہ جناب زرتشت دراصل باختر BACTARIA کے رہنے والے تھے اور ان کا زمانہ ۲۲۰۰ء ق م سے ۲۴۰۰ء ق م کے درمیان ہے۔ اس کی تائید قدیم بابلی مؤرخ HEROSUS کے بیان سے بھی ہوتی ہے۔ جس نے سکندر کے حملہ کے بعد (۳۲۵ء ق م کے قریب) اپنے ملک کی تاریخ لکھی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جناب زرتشت کا زمانہ (۲۳۳۴ء ق م) ہے لیکن ایسے محقّق بھی ہیں۔ جن کے نزدیک آپ کا زمانہ (۶۳۵۰ء ق م) کے قریب ہے۔ دوسری طرف 'THE OUTLINE OF MAN'S KNOWLEDGE' کے مؤلّف کے نزدیک آپ کا زمانہ ۱۰۰۰ء ق م سے زیادہ بعید کا نہیں۔ یہ ہے اس وقت تک کی تحقیق جناب زرتشت کے زمانہ کے متعلق۔ اب آپ خود ہی اندازہ فرمائیے کہ جن تحقیقات کی رُو سے ایک شخص کا زمانہ ۶۰۰ء ق م سے لیکر ۶۳۵۰ء ق م کی پہنائیوں میں جھولا جھول رہا ہو، اس کی زندگی کے احوال و کوائف کے متعلق یقینی طور پر کیا معلوم ہو سکتا ہے؟ غالباً اسی دقّت کے پیش نظر RENE GUENON کا خیال ہے کہ لفظ زرتشت کسی خاص شخص کا نام نہیں بلکہ یہ ایک ایسے منصب کا نام ہے۔ جس میں "نبوّت اور قانون سازی" کا مفہوم پایا جاتا ہے۔ اس لئے "زرتشت" بہت سے گزرے ہیں۔ جن میں آخری زرتشت کا زمانہ ۶۰۰ء ق م ہے (THE CRISIS OF THE MODERN WORLD - P. 16) بہرحال یہ کہا جاتا ہے کہ جناب زرتشت کے مذہب کا اوّلین گہوارہ باختر تھا۔ وہاں سے یہ مذہب ایران میں آیا اور دارا کے زمانہ میں فارس اور اس کے ۱۷ صوبوں کا حکومتی مذہب 'STATE RELIGION' قرار پا گیا۔ وہاں سے یہ گرد و نواح میں پھیلا۔ بابل کے راستے اس نے قدیم یہودی مذہب کو متأثر کیا اور اسکندریہ کی لائبریری کے راستے (حضرت عیسٰیؑ کے بعد) مذہبِ عیسائیت کا خمیر بنا۔ ۵۰۰ء قبل مسیح کے قریب یہ مذہب ہندوستان میں داخل ہوا اور برہمنیت کی شکل میں ہندوؤں کا دھرم قرار پایا۔ بعض محقّقین کا خیال ہے کہ ہندوؤں کے سری ویاس جی ایک مدت تک جنابِ زرتشت کے پاس رہے اور ان ہی سے اس تعلیم کو حاصل کر کے ہندوستان لوٹے اور ہندو دھرم کی شکل میں اس کی نشر و اشاعت کی۔ چنانچہ دساتیر نامہ زرتشت میں اس کا ذکر موجود ہے (تفصیل اس کی ہندومت کے عنوان میں ملے گی)

ژند اوستا اس مذہب کی مقدّس کتاب سمجھی جاتی ہے۔ اس کتاب کا نام اوستا ہے۔ ژند اضافی لفظ ہے۔ جس

کے دو معنی ہیں۔ ایک تو وہ زبان جو پہلوی سے بیشتر ایران میں رائج تھی۔ اس اعتبار سے ژنداوستا کے معنی ہوں گے

مقدس کتاب

"ژند زبان کی اوستا"۔ یا ژند کے معنی ہیں تفسیر۔ اس کے معنی ہوئے "اوستا کی تفسیر"۔ ژند کا شمار اب مردہ زبانوں میں ہوتا ہے۔ اوستا (جیسی کچھ بھی ہے) پہلوی زبان میں ہے۔ پھر اس تمام کتاب کی زبان بھی ایک سی نہیں۔ اس میں گتھاؤں کی زبان اور ہے اور کہا جاتا ہے کہ یہی حصہ (اپنی موجودہ مسخ شدہ صورت میں) جناب زرتشت کا ہے۔ باقی حصہ قدیم ایرانی کتابوں کا مرکب سا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کی اصلیت کے متعلق ابھی تک معلوم نہیں ہو سکا۔ جو کچھ معلوم ہو سکا ہے وہ فقط اس قدر ہے کہ پانچویں صدی قبل از مسیح میں ایران میں اس مذہب کے قریب ستر فرقے موجود تھے، جن میں سے ہر ایک کا دعوےٰ تھا کہ اصلی اوستا صرف اسی کے پاس ہے اور دوسروں کی اوستا جعلی ہے۔ ہر فرقے کی اوستا دوسرے فرقوں کی اوستا سے مختلف تھی۔ شاہ ایران ارتخشتاہ 'ARTAXEUES' نے ان اختلافات کو مٹانے کے لئے قریب (۴۵۰ قبل مسیح میں) ایک عظیم الشان کونسل منعقد کی[ل]۔ اس کونسل میں قریب اسی ہزار مغ (پجاری) اطراف و اکنافِ سلطنت سے شامل ہوئے لیکن یہ گروہ اس قدر کثیر تھا کہ کونسل کا انعقاد مشکل ہو گیا۔ اس لئے ان میں سے صرف سات مقدس مغ منتخب کئے گئے جو اپنے زہد و تورع اور علم و بصیرت کی بنا پر معتمد علیہ تصور کئے جاتے تھے۔ اس کے بعد کیا ہوا؟ یہ گبن کے الفاظ میں سنیئے:۔

> "ان سات مغوں میں سے ایک مقدس نوجوان، ادوادیرف نامی کے سامنے آتشیں شراب کے تین پیالے پیش کئے گئے۔ اس نے انہیں پیا اور اس کے بعد ایک لمبی اور گہری نیند سو گیا۔ جب وہ بیدار ہوا تو اس نے بادشاہ اور دیگر حاضرین کو بتایا کہ اس نے کس طرح آسمانوں کی سیر کی ہے۔ یہاں مقدس دیوتاؤں کی اس سے ملاقات ہوئی۔ سننے والوں کے شک و شبہ کے خیالات اس نوجوان کی مافوق الفطرت شہادتِ (آسمانی) کے سامنے دب گئے اور اس طرح زرتشت کے مذہب کا ضابطۂ قوانین مرتب کر دیا گیا۔

ل آگے بڑھنے سے بیشتر چند ورق پیچھے اُلٹ کر ذرا اس کونسل کی روئداد ایک مرتبہ پھر پڑھ لیجئے جو شاہ قسطنطین نے عیسائی فرقوں کے اختلافات مٹانے کے لئے منعقد کی تھی اور جس نے اناجیل اربعہ کا انتخاب کیا تھا۔ نیز اس واقعہ کی یاد بھی تازہ کر لیجئے کہ عذرا فقیہہ نے کس طرح تورات کو از سر نو مرتب کیا تھا۔ عزرا کو اسی بادشاہ (ارتخشتاہ) نے بابل سے یروشلم بھیجا تھا

(مزید تفصیل کے لئے دیکھئے مسٹر کپاڈیا کی کتاب 'THE TEACHINGS OF ZOROASTER'.
غور فرمائیے! یہ طریق ترتیب و تدوینِ کتاب مقدس وہی ہے، جسے عزرا (فقیہہ) نے اختیار کیا تھا۔ (اسی بناء پر مؤرخین کا خیال ہے کہ عزرا مذہبِ زرتشت ہی کا پیرو تھا اور اس نے اس مذہب کی تعلیم کو تورات کے لباس میں یہودیوں میں رائج کر دیا) بہرحال، اس طرح تعلیم جنابِ زرتشت کا جدید نسخہ مرتب کیا گیا لیکن جس طرح عزرا کا مرتب کردہ، مجموعۂ اسفارِ موسےٰ؟ بعد میں ضائع ہو گیا، اسی طرح ادوادیرف کی مرتب کردہ اوستا بھی اسکندر کے حملے کے وقت نذرِ آتش ہو گئی۔ اس واقعہ کے بعد مدتوں تک ژند اوستا کا کہیں نام نہیں ملتا۔ ازاں بعد، جنابِ زرتشت کے

ضائع شُد اقوال کے کچھ حصے، جو نسک کے نام سے مشہور تھے، پہلوی زبان میں ترجمہ شدہ پائے گئے۔ موجودہ تحقیقات کی رُو سے یہ ترجمہ قطعاً مستند نہیں اور یہ بھی کہ جن نسک کا یہ ترجمہ ہے، ان میں بہت کچھ تغیر و تبدل ہو چکا تھا۔ ساسانیوں کے زمانہ میں ان متفرق یادداشتوں کو پھر سے یکجا کیا گیا اور کافی کانٹ چھانٹ کے بعد ان کا ایک مجموعہ مرتب کیا گیا۔ اس مجموعہ کا کچھ حصہ پارسی اپنے ساتھ ہندوستان لائے جو اس وقت اوستا کے نام سے دنیا کے سامنے ہے۔ اس میں ایک حصہ یسنا کہلاتا ہے جو ٧٢ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں قربانیوں کی رسومات اور دعائیں درج ہیں۔ اس میں سے ٢٨ سے ٥٤ ابواب تک جنابِ زرتشت کی طرف منسوب ہیں۔ یہ ان کی پانچ گھتائیں کہلاتی ہیں۔ 'INTRODUCTION TO THE HISTORY OF SCIENCE' - دوسرا حصہ وندیداد کہلاتا ہے۔ جس میں دیوتاؤں اور بھوتوں سے محفوظ رہنے کے منتر ہیں، اور پارسیوں کے خدا ہرمز اور جناب زرتشت کا مکالمہ ہے۔ تیسرے وسپیرد میں بھی یسنا کی طرح دعائیں ہیں۔ چوتھا حصہ یشت ہے، جس میں متعدد خداؤں اور مردہ روحوں سے استمداد کی دعائیں درج ہیں۔

ژند اوستا کے علاوہ، ان کے ہاں سب سے زیادہ مشہور مجموعۂ کتب دساتیر ہے۔ اس میں پندرہ مختلف اشخاص کے چھوٹے چھوٹے نامے ہیں۔ مثلاً نامۂ مہ آباد وخشور[ط]۔ نامۂ زرتشت وخشور، نامۂ منوچہر، نامۂ کیخسرو۔ ان ناموں کا ساسانِ پنجم نے خسرو پرویز کے عہد میں دری زبان میں ترجمہ کیا۔ یہ نامے حقائق و بصائر اور خرافات و

ط وخشور کے معنی پیغمبر کے ہیں۔ نامہ ساسانِ پنجم سے معلوم ہوتا ہے کہ مہ آباد سے مراد غالباً (حضرت) ابراہیمؑ ہیں کیونکہ اس میں مذکور ہے کہ مہ آباد نے کعبہ کو تعمیر کیا تھا۔

اباطیل کے عجیب وغریب مجموعے ہیں۔ مثلاً ان کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کی طرح "بنام ایزد بخشاۓندہ بخشائش گر" اور تعوذ جیسی پاک تعلیم سے ہوتی ہے لیکن آگے چل کر آگ اور ستاروں کی پرستش کا ذکر ملتا ہے۔

بایں ہمہ مذہبِ زرتشت کے ان کھنڈرات میں، کہیں کہیں مٹی اور کیچڑ سے ملوث، بعض جواہر ریزے ایسے بھی پائے جاتے ہیں، جن سے مترشح ہوتا ہے کہ اس مذہب کی اصلی اور حقیقی تعلیم پاکیزہ تھی اور اس کی موجوہ مسخ شدہ

تعلیم

صورت اس کی اصلی تعلیم کبھی نہیں قرار دی جا سکتی۔ حیات بعد الممات کا عقیدہ۔ جنت اور دوزخ کا تصوّر، فرشتوں کی ہستی کا اعتراف، وحی کا اقرار۔ یہ تمام چیزیں (مسخ شدہ صورت میں) کہیں کہیں اُبھر کر سامنے آجاتی ہیں۔ یشت میں ہے:-

"ہم زرتشت سپٹاما[1] کی شریعت اور اس کے محافظ فرشتہ کی پرستش کرتے ہیں، جس کے دماغ میں سب سے پہلے نیک خیالات پیدا ہوئے۔ جس نے سب سے پہلے نیک باتیں زبان سے کہیں۔ جس نے سب سے پہلے نیک اعمال کیۓ۔ جو سب سے پہلا پجاری تھا۔ سب سے پہلا مجاہد، سب سے پہلا کاشت کار، سب سے پہلا نبی، یعنی جس پر سب سے پہلے وحی بھیجی گئی۔ وہ سب سے پہلا، جس نے نوعِ انسانی کو (اس کی) فطرت، حقیقت (قوّت) بیان سماعت، دولت، غرضیکہ وہ سب کچھ دیا جو مزدا نے پیدا کیا۔ اور جس سے حقیقت کی زینت ہوتی ہے۔ وہ جس نے سب سے پہلے انسانوں اور دیوتاؤں میں چکّر کو چلایا۔ وہ جس نے سب سے پہلے زندہ مخلوق کے تقدّس کی حمد، ستائش بیان کی۔ جس نے بت پرستی کو نیست و نابود کیا۔ جس نے اہرمزد سے متعلق زرتشتی عقیدہ کا اقرار کیا۔ وہ عقیدہ جو شیطان کے مقابلہ میں زندہ خُدا کا مذہب ہے۔ وہ جس کی وساطت سے اس کی وحی کی آواز سنائی دی۔ جو یکسر پاک ہے۔ جو تمام کائنات کے لئے زندگی اور ہدائیت ہے۔ اس کے علم اور کلام کی بدولت، روحِ مقدّس کی پیدا کردہ تمام مخلوق مسرّتوں کے نغمے گا رہی ہے۔

دیکھا آپ نے! موتیوں کے ٹکڑے لیکن بعض مقامات پر کثیف مٹی میں ملے ہوئے لیکن اس تعلیم کی سب

---

[1] 'SPITAMA' جناب زرتشت کا خاندانی نام تھا۔

سے زیادہ مسخ شدہ صورت اس وقت سامنے آتی ہے، جب ہم اس میں ثنویت[۱] کا عقیدہ دیکھتے ہیں۔ یہی عقیدہ اس مذہب کا نقطۂ ماسکہ اور مابہ الامتیاز ہے۔ یعنی ان کے نزدیک اہرمزد، خیر کا مظہر اور نور کا سرچشمہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں اہرمن شر کا پیکر اور تاریکی کا مالک ہے۔ یہ دو مستقل ہستیاں ہیں، جن میں باہمی کشمکش جاری ہے۔ خیر اور شر کے متعلق دو مستقل سرچشموں کا تصور درحقیقت اس تخیل کی بنیاد ہے، جس پر عیسائیت کی رُوح اور مادہ کے باہمی تضاد و تخالف کی عمارت قائم ہے۔ وہی عمارت جس نے ہندوستان میں آکر (روح) آتما کو برہما (اہرمزد) کا جزو' اور مادہ (پراکرتی) کو مایا (سراب) یعنی فریبِ نگاہ بنا کر دکھایا۔ وہی جو پھر عجمی تصوف کے نقاب میں دین اور دنیا کی تفریق کا موجب بنا اور انہیں جداگانہ دوائرِ زندگی میں تقسیم کرنے کا باعث ہوا۔ اس مذہب کی تعلیم یہ ہے کہ:-

"پاکیزہ روحوں کو اہرمن سے کسی قسم کا خوف نہیں۔ اہرمزد کا فیصلہ ہے کہ نیکی کو آخری فتح حاصل ہوگی۔ جب زمین پر برائیاں عام چھا جائیں گی، تو وہ اپنے پیغمبر بھیجے گا تاکہ وہ اپنے مظلوموں کی دادرسی کریں اور انسانوں کو آسمانی روشنی دکھائیں۔ بالآخر تمام دنیا اہرمزد کی پرستش اختیار کرے گی۔ لوگ گوشت کھانا ترک کر دیں گے اور صرف دودھ اور پھلوں پر زندگی بسر کریں گے۔ پھر اس کے بعد صرف پانی پر زندہ رہیں گے۔ اس کے بعد وہ ایسے پیکرِ روحانیت بن جائیں گے جو کسی قسم کی غذا نہیں کھائیں گے لیکن اس پر بھی زندہ رہیں گے۔"

غور کیجئے! "مادہ کی کثافت" سے "رُوح کی لطافت" کی طرف کس قدر باریک اشارے ہیں۔ یہ وہی ہے جو عیسائیت میں رہبانیت کی شکل میں ظاہر ہوئی، جو ہندوؤں میں یوگ اور سنیاس کے روپ میں آئی اور پھر جب عجمی تصوف ایران کے آتش کدوں سے مسلمانوں کی خانقاہوں اور زاویوں میں پہنچا، تو وہاں ترکِ دنیا اور ترکِ علائق کی صورت میں

---

[۱] بعض محققین کا خیال ہے کہ ثنویت کے عقیدہ کا بانی ایران کا مانی تھا۔ جس نے تیسری صدی عیسوی میں دعوٰے نبوّت کیا اور مجوسیت اور عیسائیت اسی تعلیم سے متاثر ہوئیں لیکن یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ مانی خود مجوسیّت اور عیسائیت کی ثنویّت سے متاثر ہوئی اور اس نے اس تعلیم کو عام کیا۔ یہ دوسرا خیال زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ (دیکھئے GEORGE SARTON کی تالیف INTRODUCTION TO THE HISTORY OF SCIENCE. VOL I. P.332.

جسلوہ بار ہوئی۔

مجوسی مذہب میں جنابِ زرتشت بلکہ اہرمزد سے بھی زیادہ ایک اور ہستی کو اہمیت حاصل ہے۔ جسے مترا یا مِصرا 'MITHRA' کہا جاتا ہے۔ اسے اہرمن و یزداں کی درمیانی کڑی اور انسان و خدا کے درمیان واسطہ سمجھا جاتا ہے۔

مترا

مترا کے متعلق .... ان کا عقیدہ ہے کہ وہ نوعِ انسانی کی نجات کے لئے دنیا میں آیا۔ دنیا والوں نے اسے سخت اذیتیں پہنچائیں اور بالآخر اس نے اپنی جان دے کر انسانی گناہوں کا کفارہ ادا کر دیا اور تیسرے دن اپنی قبر سے زندہ جی اُٹھا۔ مترا کی خارق عادت پیدائش کا دن ۲۵ دسمبر قرار دیا جاتا ہے اور مر کر جی اُٹھنے کا دن ۲۵ مارچ۔ ایران کے بعد، مترا کی پرستش، ہندوستان، بابل، مصر اور دوسرے علاقوں تک بھی پھیل گئی۔ مترا کے متعلق یہ بھی عقیدہ ہے کہ وہ آخری زمانہ میں پھر دنیا میں آئے گا اور اس کے ہاتھوں بالآخر حق کی فتح اور باطل کی مکمل شکست ہوگی۔ زرتشتی عقیدہ کے مطابق، خدا کا یہ فرستادہ، دنیا میں نیکی کی حکومت قائم کرے گا۔ اور اوستا کا وہ حصّہ بھی اپنے ساتھ لائے گا جو اس وقت تک انسانوں کی نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔ مترا کی پرستش کی طرح، یہ (آنے والے کا) عقیدہ بھی رفتہ رفتہ عام ہوگیا۔ ڈاکٹر چارلس بِگ (CHARLES BIGG) اپنے مجموعۂ خطبات 'THE CHRISTIAN PLATONISTS OF ALEXANDRIA' میں لکھتا ہے:-

"مترا قدیم دنیا کی آرین نسل اقوام کا خدا تھا۔ ویدوں میں اسے نور و صداقت دینے والا قرار دیا گیا ہے۔ پلوٹارک کا بیان ہے کہ وہ اہرمزد اور اہرمن کے درمیان واسطہ ہے۔ یا یوں کہو کہ انسان اور خدا کے درمیان وسیلہ۔ وہ سورج ہے جو اس دنیا میں انسان کی خاطر، تاریکی اور سردی کے خلاف اپنی شعاعوں کے تیروں سے مصروفِ پیکار ہے۔ اس لئے غاروں میں اس کی پرستش ہوتی تھی.....
.... یہ عقیدہ بھی تھا کہ آخر الامر دنیا میں ایک نجات دہندہ مقدّس زرتشت آئے گا۔ وہ خیر و شر کی جنگ کا خاتمہ کرے گا۔ موت اور جہنّم کو فنا کر دے گا اور اس کے بعد انسان، ابدی مسرّتوں کی دنیا میں رہے گا........ مترا کے معتقدین، توسل اور شفاعت، کفّارہ اور ایک نجات دہندہ پر ایمان رکھتے تھے۔

---

۵۱ DUPU'S ORIGIN OF RELIGIOUS BELIEFS.

جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں مذہبِ مجوس (یا متزائیت کے مسلک کے) میں ایک آنے والا کا عقیدہ بنیادی اور اساسی حیثیت لئے ہوئے تھا۔ یہ عقیدہ کچھ اس طرح پھیلا کہ مصر، یونان، ہندوستان، روم (یہودیت، عیسائیت ہندومت) غرضیکہ ہر مذہب کا جزو بن گیا۔ٹ یہودی اس وقت تک ایک آنے والے کے انتظار میں نگاہیں آسمان کی طرف لگائے بیٹھے ہیں۔ عیسائی

آنے والے کا عقیدہ

تو اعداد و شمار سے آنے والے کی آمد کا سال تک بھی متعین کر دیتے ہیں۔ (اگرچہ وہ کئی بار غلط ثابت ہو چکا ہے) چنانچہ سنہ ۱۷۴۰ء میں جرمنی کے ایک پادری بنجل 'BENGEL' نے حساب لگا کر بتایا کہ مکاشفاتِ یوحنا کی رُو سے اس آنے والے کی آمد کا زمانہ سنہ ۱۸۳۶ء کا موسمِ گرما ہوگا۔ جب یہ زمانہ قریب آنے لگا تو دنیائے کلیسا میں بڑی ہلچل مچی۔ واشنگٹن کے پادری ولیم ملر نے اس کے متعلق لیکچر دینے شروع کر دیئے۔ سنہ ۱۸۳۳ء میں اس سلسلے میں متعدد مقالے شائع کئے گئے۔ یہ سلسلہ یونہی جاری رہا کہ سنہ ۱۸۳۶ء آ پہنچا لیکن آنے والا نہ آیا۔ اس وقت حساب لگایا تو معلوم ہوا کہ بنجل کو غلطی لگ گئی۔ دراصل یہ واقعہ اپریل سنہ ۱۸۴۳ء میں ظہور پذیر ہوگا۔ پھر اس زمانہ کو سنہ ۱۸۴۳ء سے سنہ ۱۸۴۷ء اور اس کے بعد دو دو چار چار برس کر کے سنہ ۱۸۶۱ء تک کھینچا گیا لیکن اس کے بعد یہ سمجھ لیا گیا کہ کہیں حساب میں بہت بڑی غلطی لگ رہی ہے چنانچہ اب پھر کوئی زمانہ متعین نہیں کیا گیا لیکن انتظار بدستور باقی ہے۔

ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ وِشنو (جو تین خداؤں میں سے ایک ہے) نو مرتبہ اوتار کی صورت میں مختلف پیکروں میں دنیا میں آ چکا ہے۔ آخری مرتبہ وہ بدھ کی شکل میں آیا تھا لیکن ابھی اسے ایک مرتبہ اور بھی دنیا میں آنا ہے۔ یہ اس وقت ہوگا۔ جب دنیا سے ویدوں کی تعلیم اور شاستروں پر عمل اٹھ جائے گا اور دنیا کا خاتمہ قریب آ جائے گا۔ اس وقت وشنو آخری اوتار کی شکل میں آئے گا۔ وہ تمام چوروں اور ڈاکوؤں کا خاتمہ کر دے گا اور جس جس من میں پاپ ہوگا، اسے فنا کے گھاٹ اتار دے گا (لیکن بدھ مت والے، اس سے الگ خود اپنے ہاں ایک آنے والے متیا کے

ٹ مختلف انبیائے کرامؑ نے جن کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے، جس آنیوالے کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ چودہ سو سال ہوئے آیۂ رحمت بن کر آیا اور دنیا کو خدا کا آخری پیغام دے کر چلا بھی گیا لیکن یہ لوگ ابھی تک ایک آنے والے کے انتظار میں ہیں لیکن ان سے بھی زیادہ حیرت خود مسلمانوں پر ہے۔ یہ بھی ان کی دیکھا دیکھی ایک آنے والے کے منتظر ہیں۔

(تفصیل اس اجمال کی میری کتاب "معراجِ انسانیت" کے آخری باب "ختمِ نبوت" میں دیکھئے۔

منتظر ہیں۔) ان تمام عقائد کا سرچشمہ مجوسیت ہے۔ ہندوؤں کے ہاں اسے غالباً ویاس جی لائے۔ باقی رہے یہودی اور عیسائی یا یونانی اور رومی۔ سو میکس مُلر 'MAX MULLER' کے بیان کے مطابق ژنداوستا کا یونانی ترجمہ تیسری صدی قبل مسیح کے قریب اسکندریہ کی لائبریری میں پہنچ چکا تھا[1] اور یہی وہ لائبریری تھی جو ان خیالات و معتقدات کی نشر و ترویج کا عام ذریعہ تھی۔ عیسائیوں نے اپنے پورے مذہب کی عمارت اسی لائبریری کے مسالہ سے تیار کی اور پھر اس خیال سے کہ ان کے مذہبی عقائد کے ماخذ کا سراغ نہ مل سکے، اس لائبریری کو نذر آتش کرکے راکھ کا ڈھیر بنا دیا۔

اسکندریہ کی لائبریری

وہ عظیم الشان لائبریری، جو بطلیموس فلاڈلفس کے عہد (تیسری ق۔م) میں دو لاکھ کتابوں پر مشتمل تھی۔ ان کتابوں کی تعداد ۴۷ق۔م میں سات لاکھ تک جا پہنچی تھی، جب جولیس سیزر 'JULIUS CAESER' نے اسے پہلی مرتبہ آگ لگائی لیکن اس کے بعد قلوپطرہ نے اس گم گشتہ متاعِ گراں بہا کی بازیابی کی کوشش کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کتابوں کی تعداد چار لاکھ تک پہنچا دی لیکن ۳۹۰ء کے قریب، مقدس راہبوں کے ہاتھوں نے اسے اس طرح شعلوں کی نذر کر دیا کہ اس کا نشان تک باقی نہ چھوڑا۔ یہی وہ شعلے ہیں جن کا الزام، بعض متعصب مستشرق، مسلمانوں کے سر تھوپنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ حالانکہ خود انہی کی یہ تحقیق ہے کہ:-

> "۳۹۱ء کے قریب عیسائی مذہبی دیوانوں کی ایک جماعت نے آرک بشپ تھیوفلس کی سرکردگی میں بے پناہ یورش کرکے مندر کو مسمار اور لائبریری کو تباہ کر دیا۔ اس لائبریری کی تباہی ان کے ہاتھوں سے ہوئی تھی نہ کہ مسلمانوں کے ہاتھوں سے۔ جب انہوں نے (حضرت) عمرؓ کے عہد میں اسکندریہ کو فتح کیا ہے۔-
>
> (LIBRARY OF USEFUL KNOWLEDGE ARTICLE:- ALEXANDRIA LIBRARY)
>
> نیز دیکھئے: SARTON کی کتاب
>
> INTRODUCTION TO THE HISTORY OF SCIENCE. P. 466

یہ ہے مختصر سی کیفیت مذہب زرتشت اور اس کی مقدس کتابوں کی۔ وہ مذہب جس کے آغاز اور حقیقی تعلیم کے متعلق تاریخ بالکل خاموش ہے لیکن جس کی مسخ شدہ تعلیم نے دنیا کے قریب قریب تمام بڑے بڑے مذاہب کو متاثر کر دیا اور ان مذاہب کو بھی کچھ کا کچھ بنا دیا۔ آج پارسیوں کو اس مذہب سے اتنا سا ہی تعلق رہ گیا ہے کہ وہ آگ

---

[1] دیکھئے "CHIPS FROM A GERMAN WORKSHOP - VOL. I" ص۱

کی پرستش کرتے ہیں۔ گائے کے پیشاب کو مقدس سمجھتے ہیں۔ جسے ان کے ہاں نرنگ کہا جاتا ہے اور شراب کو جائز، کہ اس سے "نیک و بد کی تمیز" ہو جاتی ہے۔ (بحوالہ کپاڈیا صد ۸۴)

نگہ بازگشت

مذہبِ زرتشت کے متعلق جو کچھ ہمارے سامنے آیا ہے، اس کا ماحصل یہ ہے کہ:۔

۱۔ ابھی تک یہ متحقق نہیں ہو سکا کہ جنابِ زرتشت کس زمانہ میں پیدا ہوئے تھے۔ مختلف تاریخی تحقیقات کے مطابق آپ کا زمانہ چھ سو سال قبل مسیح سے لے کر چھ ہزار قبل مسیح تک قرار دیا جا سکتا ہے۔

۲۔ اوستا اس مذہب کی مذہبی کتاب ہے جو ژند زبان میں تھی۔ یہ زبان پہلوی زبان سے پہلے فارس میں رائج تھی لیکن یہ آجکل اس کا شمار مردہ زبانوں میں ہے۔ ژند زبان میں اوستا کا کوئی نسخہ موجود نہیں۔

۳۔ پانچویں صدی قبل مسیح میں اس مذہب کے مختلف فرقوں کے پاس اوستا کے مختلف نسخے تھے۔ ارتخشتاہ (شاہِ ایران) نے ایک عظیم الشان مجلس منعقد کی تاکہ اوستا کا ایک مستند نسخہ مرتب کیا جائے۔ ایک نوجوان مُغ نے آتشیں شراب کے اثر کے ماتحت آسمانوں کی سیر کی اور اس طرح اوستا کا نسخہ مرتب کر دیا جسے مقدس سمجھ لیا گیا۔

۴۔ یہ نسخہ اسکندریہ کے حملہ کے وقت ضائع ہو گیا۔

۵۔ اس کے بعد جنابِ زرتشت کے متفرق اقوال جمع کئے گئے۔ مرورِ زمانہ سے ان میں بھی بے حد تغیر و تبدل واقع ہو گیا۔ ساسانیوں کے عہد میں ان متفرق یادداشتوں کو یکجا مرتب کیا گیا۔ اسی کا ایک حصہ پارسی اپنے ساتھ ہندوستان لے آئے۔ اب یہی اوستا کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے علاوہ وساتیر کا مجموعہ بھی مقدس سمجھا جاتا ہے جو متعدد اشخاص کے نامہ جات کا مجموعہ ہے۔

۶۔ اس مذہب کی تعلیم میں کہیں کہیں صداقت کے جواہر پاروں کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے لیکن کثیف مٹی میں ملے ہوئے۔ اہرمن و یزداں کی ثنویت اور متھرا کی پرستش اس کے بنیادی عقائد ہیں۔ اس کے علاوہ ایک آنے والے کا تصور نقطۂ ماسکہ۔ اس مذہب نے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کو اپنے عقائد و تصورات سے متاثر کیا ہے لیکن اب پارسیوں کی آتش پرستی کے علاوہ اس میں کچھ اور باقی نہیں رہا۔

باب چہارم

ہندو مت

— ۴ —

اب ہم اپنے سفر کے اس حصہ میں پہنچ رہے ہیں جہاں راستہ نہایت دشوار گزار اور مرحلہ بہت نازک ہے۔ اس لئے کہ آج تک یہ متعین ہی نہیں کیا جا سکا کہ ہندو کہتے کسے ہیں۔ اس لئے یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ ہندو مت ہے کیا؟ مذہبی عقائد کی رُو سے ایک ہندو دوسرے ہندو سے اتنا مختلف ہو سکتا ہے جتنا ایک ہندو کسی غیر ہندو سے۔ ذرا آگے چل کر آپ خود دیکھ لیں گے کہ ہندو مت کن کن متضاد عناصر کے مجموعہ کا نام ہے۔ بنارس ہندو یونیورسٹی کی کورٹ کونسل اور سینیٹ کے ممبر مسٹر گووندداس اپنی کتاب ہندوازم میں لکھتے ہیں:۔

"اگرچہ سب سے پہلے اس امر کا متعین کر لینا نہایت ضروری ہے کہ ہندو مت کسے کہتے ہیں اور اس کا ماخذ کیا ہے؟ لیکن جنہوں نے اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کی ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ اس کا جواب کس قدر مایوس کن ہے۔ ہندو دھرم کی کوئی تعریف 'DEFINITION' ممکن نہیں۔ اس لئے کہ اس کے حدود ہی متعین نہیں۔ یہ باب دراصل علم الانسان سے متعلق تھا جسے بدقسمتی سے مذہب کا نام دے دیا گیا ہے۔ ویدوں سے شروع ہو کر اور چند ایک قبائل کے رسم و رواج کو اپنے آغوش میں لے کر یہ آگے بڑھا اور ایک برف کے گولے کی طرح مختلف زمانوں میں لڑھکتے لڑھکتے اپنے حجم میں بڑھتا چلا گیا اور جس جس قوم اور قبیلہ سے یہ متمسک ہوا، اس کے رسوم اور تخیلات کو اپنے اندر جذب کرتا گیا۔ حتٰی کہ اس وقت تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ یہ مذہب محیطِ کُل، ہمہ گیر، ہر ایک کو اپنے اندر جذب کر لینے والا، سب کچھ برداشت کر لینے والا ہر ایک کو (اپنی اپنی جگہ) مطمئن رکھنے والا اور ہر ایک کے ارشاد کی تعمیل کرنے والا واقعہ ہوا ہے۔" (ص ۴۵)

ہندو کسے کہتے ہیں

اس کے بعد مسٹر گووندداس لکھتے ہیں کہ ہندو ہونے کے لئے:۔

۱۔ ہندو گھرانے میں پیدا ہونے کی بھی شرط نہیں۔

۲۔ بھارت ورش کے حدود کے اندر پیدائش کی بھی شرط نہیں۔

۳۔ ویدوں پر ایمان بھی ضروری نہیں۔ گیتا بڑی سختی سے ویدوں کی تکذیب کرتی ہے۔ چارواک بڑے شدّ ومد سے ان کا مذاق اڑاتے ہیں اور انہیں مسخروں اور پشاچ (رنگین طبع) لوگوں کی تصانیف قرار دیتے ہیں ؎۔ جینی، سکھ اور کئی فرقے ان کی تردید کرتے ہیں۔ ہندومت ویدوں کی تصانیف سے بھی پہلے موجود تھا۔ اس کی فنا یا بقا ویدوں سے منسلک نہیں۔

۴۔ ذات، پات (یعنی ورنوں کی تقسیم) کا عقیدہ بھی ضروری نہیں۔

۵۔ گائے کی تقدیس اور برہمنوں کی عظمت کا عقیدہ بھی ضروری نہیں۔ اچھوت گائے کا گوشت بلا اعتراض کھا جاتے ہیں۔

۶۔ خدا پر ایمان بھی ضروری نہیں۔ ہندوؤں کے چھ قدیمی مذاہب فلسفہ میں سے یوگ کے سوا اور کوئی خدا کا قائل نہیں۔

۷۔ سر کی چٹیا بھی ضروری نہیں۔

۸۔ زنار کی بھی شرط نہیں۔

۹۔ کھانے پینے میں حلال اور حرام کی بھی کوئی پابندی نہیں۔ جو ایک کے نزدیک حلال ہے، وہ دوسرے کے نزدیک حرام ہے۔

۱۰۔ کوئی رسم ورواج بھی ایسا نہیں جو لاینفک ہو۔

۱۱۔ کرم (جزا و سزا) روح اور اوتاروں پر ایمان رکھنا بھی ضروری نہیں۔

۱۲۔ "ہندو لاء" (ہندوؤں کے مروجہ قانون) کا اطلاق بھی ضروری نہیں۔ اس لئے کہ یہ قانون بھی متضاد عناصر کا مجموعہ ہے جو ایک کے نزدیک نہائت ضروری ہے، وہ دوسرے کے ہاں یکسر غیر ضروری ہے۔

۱۳۔ نسل اور رنگ کا امتیاز بھی کوئی ضروری شرط نہیں۔ لہٰذا اس سے ظاہر ہے کہ ہر وہ شخص جو ہندو کہلانے سے انکار نہیں کرتا، یا یوں کہیئے کہ جو اقرار کرتا ہے کہ وہ ہندو ہے، ہندو قرار دیا جا سکتا ہے۔
(ہندوازم ۵۷-۵۰)

؎ ویدوں کے مصنفین کے متعلق ایسا کچھ لکھنے کی جرأت ایک ہندو مصنف ہی کر سکتا ہے۔ ہم نہیں کر سکتے۔

غور کیجئے کہ ایسے مذہب کے متعلق تاریخی چھان بین اور اس کے "مسلمات" کی تحقیق و تفتیش کس قدر مشکل ہے۔ یعنی جہاں یہی متعین نہیں ہو سکا کہ ہندو ہونے کے لئے شرائط کیا ہیں، وہاں ان شرائط کے اصلی یا محرف ہونے کے متعلق کیا تحقیق کیا جا سکے؟ اس باب میں پنڈت جواہر لال نہرو اپنی سوانح عمری میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ہندو مت کے دائرہ میں بے حد مختلف اور بعض اوقات متضاد خیالات اور رسوم داخل ہیں۔ اکثر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہندو مت پر صحیح معنوں میں مذہب کا اطلاق نہیں ہوتا لیکن اس کے باوجود اس کی گرفت کتنی سخت ہے اور اس میں بقاء کی کتنی زبردست قوت موجود ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کھلم کھلا خدا کا منکر ہو (جیسے قدیم ہندو فلسفی چارواک تھے) لیکن یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص ہندو نہیں رہا۔ جو لوگ ہندو گھرانوں میں پیدا ہوتے ہیں، وہ چاہے کتنی ہی کوشش کریں، ہندو مت ان کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتا۔ میں برہمن پیدا ہوا تھا اور برہمن ہی سمجھا جاتا ہوں، چاہے مذہبی اور سماجی رسموں کے متعلق میرے خیالات اور میرے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں"۔ (میری کہانی، جلد اول صـ ۲۰۲)

۱۹۴۶ء میں پنڈت جی کی ایک کتاب 'THE DISCOVERY OF INDIA' شائع ہوئی تھی، جس میں انہوں نے ہندوازم کے متعلق مزید تفصیل سے لکھا تھا۔ وہ اس باب میں رقمطراز ہیں:۔

"ہندوازم بحیثیت ایک عقیدہ کے بالکل مبہم، غیر متعین اور بہت سے گوشوں والا واقع ہوا ہے جس میں ہر شخص کو اس کے مطلب کے مطابق بات مل جاتی ہے۔ اس کی تعریف 'DEFINITION' بتانا ممکن نہیں۔ حتیٰ کہ حتمی طور پر یہ کہنا بھی مشکل ہے کہ آیا یہ کوئی مذہب بھی ہے یا نہیں۔ یہ اپنی موجودہ شکل و صورت میں بہت سے عقائد اور رسوم کا مجموعہ ہے جو اعلیٰ سے اعلیٰ بھی ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ بھی، باہم دگر مختلف۔ حتیٰ کہ ایک دوسرے سے متضاد، اس کا لازمی عنصر غالباً جذبہ رواداری ہے۔ مہاتما گاندھی نے کوشش کی ہے کہ اس کی تعریف 'DEFINITION' پیش کر سکیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"اگر مجھ سے کہا جائے کہ ہندو مذہب کی تعریف بیان کرو تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ یہ عدم تشدد کے ذریعہ سچائی کی تلاش کا نام ہے۔ ایک شخص خواہ خدا کو بھی نہ مانے لیکن بایں ہمہ وہ ہندو کہلا سکتا ہے۔ ہندوازم نہایت شدت سے سچائی کی تلاش کا نام ہے۔ ہندوازم سچائی کا مذہب

ہے۔ سچائی ہی خدا ہے۔ خدا کے انکار سے ہم واقف ہیں لیکن سچائی سے انکار کہیں نہیں سنا گیا۔"

گویا گاندھی جی کے الفاظ میں اہمسا اور سچائی، یہ ہے ہندو مذہب لیکن بہت سے مشہور اور سچے ہندو یہ کہتے ہیں کہ اہمسا ہندو مذہب کا جزو نہیں ہے۔ لہٰذا باقی صرف سچائی رہ گئی، جسے ہم ہندو مذہب کہہ سکتے ہیں لیکن یہ تو کوئی تعریف نہیں۔" (ص ۵۳)

گاندھی جی کی تصریحات پر غور کیجیے۔ یعنی ایک شخص خدا کا منکر ہوتے ہوئے بھی صداقت 'TRUTH' کا متلاشی رہ سکتا ہے؟ اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا ہے کہ "صداقت ہی خدا ہے۔" معلوم نہیں کہ پھر "خدا کے انکار اور صداقت کی تلاش" سے ان کا مطلب کیا ہے؟

میرے ایک دوست نے ہندو اکابر مثل بنارس ہندو یونیورسٹی کے ڈین اور مہاتما گاندھی کی خدمت میں استفسارات بھیجے کہ وہ اس موضوع پر کچھ روشنی ڈالیں کہ کسی شخص کے ہندو ہونے کے لئے کیا شرائط ہیں لیکن ان کی طرف سے ان استفسارات کا کوئی جواب موصول نہ ہوا۔ اس باب میں مہاتما گاندھی کے اخبار ہریجن (بابت ۱۵/۱۲/۴۶) کے مقالہ افتتاحیہ کی ذیل کی سطور کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہیں ہوگا۔ اس میں لکھا ہے:-

"ایک طویل عرصہ کے مصائب اور سخت تجربہ کے بعد، ہندوستان کے مذہبی فرقوں نے مذہبی رواداری کا جوہر بطور عادتِ عامہ پیدا کیا۔ اگر ہندو ازم کی اصطلاح کا اطلاق شومت، وشنومت، جین مت بدھ مت، وحدانیت، شرک، حیوان پرستی، حتیٰ کہ خدا سے انکار جیسے متضاد و متخالف مسالک پر کیا جا سکتا ہے تو ان سب میں قدرِ مشترک غالباً یہی جذبۂ رواداری[۱] TOLERANCE ہے۔"

ہریجن بابت ۱۵/۱۲/۴۶)

---

[۱] یعنی ہندو ازم کی خصوصیتِ کبریٰ بلکہ اس کی اساس و بنیاد اس پر ہے کہ یہ متضاد سے متضاد عناصر کو بھی اپنا کر جذبۂ رواداری کا ثبوت دیتا ہے۔ اس قسم کی رواداری کے متعلق گبن لکھتا ہے کہ:-

"ایک رواداری فلاسفر کی ہے جس کے نزدیک سب مذاہب سچے ہیں۔ ایک رواداری مؤرخ کی ہے، جس کے نزدیک سب مذاہب جھوٹے ہیں۔ ایک رواداری سیاسی مدبّر کی ہے، جس کے نزدیک تمام مذاہب اس کی مطلب براری کے لئے یکساں مفید ہیں۔ ایک رواداری اس شخص کی ہے جو ہر قسم کے خیالات اور مشارب کو برداشت کر لیتا ہے۔ محض اس لئے کہ وہ کسی مسلک و مشرب (باقی بر ص ۷۴)

ہندومت کے متعلق یہ چیز کچھ آج کی پیدا شدہ نہیں۔ خود منوجی کا قول ہے کہ "دھرم کی سچی اتباع اپنے آپ کو اپنے ماحول کے قالب میں ڈھال لینے کا نام ہے۔" (ہندوازم ص۵۹) مسٹر گووند داس کی تحقیق کے مطابق تو ہندو کا لفظ بھی سنسکرت زبان کی کسی قدیم یا جدید کتاب میں نہیں ملتا، بلکہ اس کا سراغ پارسیوں کی ژند اور اوستا میں ملتا ہے (ص۴۷)۔

باقی رہا باہمی تضاد کا معاملہ، سو خود مہابھارت میں ہے کہ:-

"ویدوں کے احکام ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ اسی طرح سمرتی کے احکام بھی۔ کوئی رشی ایسا نہیں، جس کی تعلیم دوسرے رشی کی تعلیم کے مخالف نہ ہو۔" (ہندوازم ص۶۲)

اس تضاد کے علاوہ ایک بڑی دقت یہ بھی ہے کہ ہندوؤں کی تاریخ کہیں محفوظ نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ (علامہ اقبالؒ کے

تاریخ محفوظ نہیں

الفاظ میں) جس طرح ایک فرد کی انفرادیت کا انحصار اس کے حافظہ پر ہوتا ہے، اگر اس کا حافظہ ضائع ہو جائے تو اس کا احساسِ انفرادیت بھی ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے انا کو کھو بیٹھتا ہے۔ اسی طرح ایک قوم کی انفرادیت کا مدار اس کے قومی حافظہ، یعنی تاریخ پر ہوتا ہے۔ جس قوم کی تاریخ محفوظ نہیں رہتی۔ اس کا قومی تشخص بھی باقی نہیں رہتا۔ اس دشواری کے متعلق 'GEORGE SARTON' اپنی کتاب 'INTRODUCTION TO THE HISTORY OF SCIENCE' میں لکھتا ہے:-

"وقائع نگاری کے فقدان کی وجہ سے ہندو سائنس کا مطالعہ بہت دشوار ہو چکا ہے...... ہندوؤں کی بیان کردہ تواریخ اسی صورت میں قابلِ یقین سمجھی جاسکتی ہیں جب ان کی توثیق غیر ہندی (یونانی، عربی، چینی) مؤرخ کریں۔" (ص۳۶)

مؤرخین کی تحقیق یہ ہے کہ "۱۲۰۰ء سے پہلے کی ہندوستان کی تاریخ کے متعلق کوئی قابلِ تذکرہ کتاب جس کو تاریخی کتاب کہا جاسکے یا کوئی ایسی تصنیف جس سے اس ملک کے تاریخی حالات معلوم ہو سکیں، اس ملک کے باشندوں یعنی ہندوؤں نے نہیں لکھی۔" (مقدمہ تاریخِ ہند قدیم ص۱۰۵) مشہور مؤرخ الفنسٹن (سابق گورنر صوبہ بمبئی) اپنی

(بقیہ فٹ نوٹ صے سے آگے) کو کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ ایک رواداری ایک کمزور انسان کی ہے جو محض اپنی کمزوری کی وجہ سے ان تمام حملوں کو برداشت کرتا ہے جو ان خیالات اور افراد پر کئے جاتے ہیں۔ جو اسے محبوب ہیں۔

رواداری کی ان اقسام میں سے کوئی قسم بھی بقول علامہ اقبالؒ، اخلاقی قیمت نہیں رکھتی۔

کتاب تاریخ ہند میں رقمطراز ہے:۔

"جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی کیسی ہی جاہل اور اکھڑ قوم کیوں نہ ہو، اکثر اپنے آباء و اجداد کے حالات کی کوئی نہ کوئی کتاب رکھتی ہے تو اس بات پر کمال تعجب ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے پاس باوجودیکہ ان کی قوم نہایت عمدہ شائستگی اور تربیت کے درجے پر پہنچ گئی تھی، کوئی کتاب تاریخ سے ملتی جلتی بھی نہیں ہے۔ ہندوؤں کے حالات کی تحریروں میں سے جو کچھ موجود ہے، وہ جھوٹی کہانیوں اور مبالغہ آمیز جھوٹے تاریخی واقعات سے اس طرح غلط ملط ہے کہ ان میں سے کوئی سچی مسلسل تاریخ نکلنے کی توقع نہیں ہو سکتی اور نہ کسی عام واقعے کی تاریخ، سکندر کے یورش کرنے سے پہلے کی قائم ہو سکتی ہے اور نہ کوئی مسلسل بیان ہندوؤں کے حالات کا ہندوستان پر مسلمانوں کے تسلط کرنے تک کا لکھا جا سکتا ہے۔"

مشہور فرانسیسی عالم ڈاکٹر لیبان کا بیان ہے:۔

"ان ہزارہا جلدوں میں جو ہندوؤں نے اپنے تین ہزار سال کے تمدن میں تصنیف کی ہیں، ایک تاریخی واقعہ بھی صحت کے ساتھ درج نہیں ہے۔ اس زمانہ کے کسی واقعہ کو متعین کرنے کے لئے ہمیں بالکل بیرونی سہاروں سے کام لینا پڑتا ہے۔ ان کی تاریخی کتابوں میں یہ عجیب خاصیت (یعنی) ہر چیز کو غلط اور غیر فطری صورت میں دیکھنے کی نہایت بیّن طور پر پائی جاتی ہے اور انسان کو اس خیال پر مجبور کرتی ہے کہ ان کا دماغ ہی ٹیڑھا ہے ...... قدیم ہندوؤں کی کوئی تاریخ ہی نہیں ہے اور نہ عمارات اور یادگاروں سے اس کی تلافی ہوتی ہے ...... ہندوستان کا تاریخی زمانہ فی الواقع مسلمانوں کی فوج کشی کے بعد سے شروع ہوا اور ہندوستان کے پہلے مورخ مسلمان ہیں۔"

(تمدنِ ہند صفحہ ۱۴۴ - ۱۴۷)

خود بھائی پرمانند کا ارشاد ہے:۔

"ہندوستان میں عام طور پر جو تاریخی کتابیں رائج ہیں۔ ان کے تین حصے ہیں: زمانۂ قدیم، جو کہ بالکل نامکمل ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے بزرگوں کو اپنے حالات درستی سے قلم بند کرنے کا شوق نہ تھا، اور جو کچھ حالات لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ وہ شاعرانہ مبالغہ سے بھرے ہوئے ہیں۔ جن کی امداد سے صحیح واقعات پر پہنچنا محال ہے۔ غالباً سوسائٹی کے اندر ایسی تبدیلیاں ہوئی ہی نہ ہوں گی، جن کو قلم بند

کرنے کا انہیں خیال آتا۔ (رسالہ زمانہ کانپور، ستمبر و اکتوبر ۱۹۱۴ء، مضمون "تاریخِ ہند" کا مطالعہ۔

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب 'THE DISCOVERY OF INDIA' میں رقمطراز ہیں:۔

"اہلِ چین، اہلِ یونان اور عربوں کے برعکس، قدیم ہندوستان کے لوگ مؤرخ نہیں تھے۔ یہ ہماری بڑی بدقسمتی ہے اور اسی نے یہ دشواری پیدا کر دی ہے کہ ہم گذشتہ عہد کے واقعات کا زمانہ یا تاریخ متعیّن کر سکیں۔ یہ واقعات کچھ اس طرح باہمد گر گتھم گتھا ہو رہے ہیں کہ ان سے عجیب خلفشار پیدا ہو جاتا ہے .... ہمارے ہاں صرف ایک کتاب (یعنی کلھان کی راج ترنگنی) ایسی ہے جسے ہم تاریخی کتاب کہہ سکتے۔ یہ کتاب کشمیر کی تاریخ ہے اور بارھویں صدی عیسوی میں لکھی گئی تھی۔ باقی واقعات کے لئے ہمیں تصورات کی دنیا میں جانا پڑتا ہے ...... یا پھر بیرونی مؤرخین، مثل اہلِ یونان، اہلِ چین اور عربوں کی شہادت پر .... مثال کے طور پر بکرمی سمت کو لیجئے۔ یہ ۵۷ء قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے لیکن اس زمانہ کے ادھر اُدھر ہمیں تاریخ میں کسی بکرماجیت کا اتا پتہ نہیں ملتا۔ اب بکرماجیت چوتھی صدی عیسوی میں گزرا ہے لیکن یہ چوتھی صدی عیسوی کا بکرماجیت اس سمت کا موجد کیسے ہو سکتا ہے جو ۵۷ء ق.م سے شروع ہوتا ہے۔ اس بکرماجیت کو اس سمت سے متعلق ثابت کرنے کے لئے ہمارے پڑھے لکھے طبقہ نے جس طرح تاریخ سے کھیل کھیلا ہے، وہ نہایت تعجب انگیز ہے۔ وہ اس بات پر بھی بڑا زور دیتے ہیں کہ یہی وکرم ہے، جس نے باہر سے آنے والوں کے خلاف جنگِ آزادی کو برپا کیا اور اس بات کے لئے اپنی پوری کوشش صرف کر دی کہ ہندوستان اکھنڈ رہے اور ایک ہی قومی حکومت کے ماتحت ہو۔ حالانکہ وکرم کی سلطنت شمالی اور وسطی ہندوستان سے آگے نہیں تھی .... یہ حقیقت ہے کہ ہندوستانی (یعنی ہندو) اپنی قدیم روایات ہی کو تاریخ تسلیم کر لیتے ہیں اور اس پر کسی قسم کی ناقدانہ نگاہ نہیں ڈالتے۔ انہیں اس قسم کے غیر ذمہ دارانہ طریقِ فکر اور نہایت آسانی سے نتائج تک پہنچ جانے کے مسلک کو بالآخر چھوڑنا پڑے گا۔" (صفحہ ۷۷ - ۷۹)

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، جس قوم کی تاریخ محفوظ نہ ہو، اس کا قومی حافظہ ضائع ہو جاتا ہے اور جب حافظہ ضائع ہو جائے تو ظاہر ہے کہ کسی واقعہ کی نسبت بھی یقینی طور پر نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کب ظہور پذیر ہوا۔ چنانچہ ہندو

زمانہ کا تعین اپنے دھرم کی قدامت کے مدعی ہیں، اس لئے وہ (شاید غیر شعوری طور پر) ہر واقعہ کو قدیم سے قدیم زمانہ کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور لاکھوں برس کے اعداد و شمار سے ورے کسی چیز کو متعین ہی نہیں کرتے۔ مثلاً سوریہ جا سدھانتا ہندوؤں کی علم ہیئت کی مشہور کتاب ہے ــــ 'SARTON' کی تحقیق کے مطابق یہ کتاب پانچویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے (سارٹن کی کتاب مذکور صـ۳۸۷) اور پادری نبٹلی صاحب اسے گیارہویں صدی عیسوی کی تصنیف خیال کرتے ہیں لیکن ہندو اس کتاب کو اکیس لاکھ پینسٹھ ہزار سال قبل کی تصنیف بتلاتے ہیں۔ (کلیات آریہ مسافر، حصہ اوّل، صفحہ ۱۱)

ہندوؤں کے ہاں دنیا کو چار زمانوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جن کی مدت حسب ذیل ہے:-

۱۔ ست جگ ۱۷,۲۸,۰۰۰ سال

۲۔ ترت جگ ۱۲,۹۶,۰۰۰ "

۳۔ درا پارہ ۸,۶۴,۰۰۰ "

۴۔ کال جگ موجودہ زمانہ، جس کے پانچ ہزار سال گزر چکے ہیں اور جس کی مدت ۴,۳۲,۰۰۰ سال کی ہے۔ (ملاحظہ ہو ہندوازم، صفحہ ۲۰۱)

جینیوں کے ہاں زمانہ کا شمار کس حساب سے ہوتا ہے۔ اس کے متعلق سوامی دیانند صاحب نے اپنی کتاب "ستیارتھ پرکاش" میں عجیب و غریب معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان کی تحقیق کے مطابق:-

ستر لاکھ سال × ایک کروڑ × چھپن ہزار × ایک کروڑ = ایک پورو

۱ اسنکھیات پورو = پلیوپم کال

دس کروڑ پلیوپم کال × دس کروڑ پلیوپم کال = اُت سرپنی کال

اُت سرپنی کال × اُت سرپنی کال = کال چکر

مذکورہ بالا اعداد و شمار میں اسنکھیات کا مفہوم جب تک سمجھ میں نہ آجائے، بات آگے نہیں چل سکتی۔ اس لئے اسنکھیات کے متعلق سوامی جی نے ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک چار کوس مربع اور اتنا ہی گہرا کنواں کھود کر اس کو ایسے بالوں کے ٹکڑوں سے بھر دیں جو آج کل کے آدمیوں کے بال سے چار ہزار چھیانویں حصہ پتلا ہو۔ ان پتلے بالوں کے ایسے چھوٹے ٹکڑے کریں کہ ایک انگل میں چھپن ٹکڑے ہوں۔ ان ٹکڑوں سے اس کنوئیں کو اس طرح ٹھوس دبا کر بھریں کہ اس کے اوپر سے کل روئے زمین کے راجہ کا لشکر گزر جائے، تب بھی نہ دبے۔ اب ان ٹکڑوں میں سے

سوسو سال کے بعد ایک ایک ٹکڑا نکالیں۔ جب وہ کنواں خالی ہو جائے، تب ایک پلیوپم کال ہوتا ہے۔ اس سے اگلا حساب سمجھ لیجئے۔ (وید اور اس کی قدامت — مولانا اکبر شاہ خاں مرحوم)

جب زمانہ کے تعیّن اور شمار کے متعلق ایسے ایسے معیار مقرر ہوں تو ظاہر ہے کہ واقعات و حوادث بھی ان ہی پیمانوں سے ماپے جائیں گے۔ چنانچہ مہاراج رام چندر جی کے والد بزرگوار راجہ دسرتھ کے متعلق تحریر ہے کہ جب ان کی عمر ساٹھ ہزار سال کی ہوئی، تو ان کے ہاں چار بیٹے پیدا ہوئے۔ (ہندوازم، صفحہ ۱۳۴) اسی طرح لکھا ہے کہ...... مہارانی سیتا جی کی پہلی اولاد اس وقت ہوئی، جب ان کی عمر دس ہزار تینتیس سال کی تھی۔ (ایضاً) اور یہ معلوم ہے کہ سیتا جی کا سوامبر پانچ سال کی عمر میں ہوا تھا، جبکہ رام چندر جی کی عمر بارہ برس کی تھی۔ مہاراجہ رام چندر جی کی عمر کا اندازہ اس سے لگائیے کہ جب سب کچھ ہو چکنے کے بعد سیتا جی زمین میں سما گئی ہیں تو اس واقعہ کے دس ہزار سال بعد تک رام چندر جی مہاراج برسرِ حکومت رہے۔ (یہ سب کچھ رامائن کے بیان کے مطابق ہے) اسی طرح راجہ بھارت کی عمر (جس کی نسبت سے ہندوستان کو بھارت ورش کہا جاتا ہے) شاستر میں دس ہزار برس کی لکھی ہے۔

اگرچہ، جیسا کہ مسٹر گووند داس نے لکھا ہے۔ ہندو ہونے کے لئے ویدوں کا ماننا بھی ضروری نہیں لیکن چونکہ عام طور پر ہندو دھرم کی بنیاد ویدوں پر قرار دی جاتی ہے، اس لئے موضوع کی ابتداء ویدوں ہی سے کی جانی مناسب ہے۔ وید کے لفظی معنی ہیں علم۔ اگرچہ آجکل عام طور پر یہی سمجھا جاتا ہے کہ وید چار کتابوں کا نام ہے لیکن درحقیقت وید کسی خاص کتاب کا نام نہیں۔ ڈاکٹر سریندر ناتھ داس گپتا (پرنسپل سنسکرت کالج کلکتہ) اپنی مشہور کتاب[1] A HISTORY OF INDIAN PHILOSOPHY. Vol I میں لکھتے ہیں۔

وید

"ایک مبتدی جسے پہلے پہل سنسکرت لٹریچر سے متعارف کرایا جائے، یہ دیکھ کر پریشانی سی محسوس کرے گا کہ متضاد مطالب اور موضوعات پر مختلف مستند کتابیں ہیں لیکن ان سب کا نام وید یا سرتی (سنی سنائی باتیں) ہے۔ یہ اس لئے کہ وید اپنے وسیع مفہوم کے اعتبار سے کسی خاص کتاب کا نام نہیں بلکہ یہ نام ہے قریب دو ہزار سال کے طویل عرصہ پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا۔ چونکہ یہ لٹریچر مظہر ہے،

---

[1] یہ کتاب اپنے موضوع پر بہت اہم ہے۔ آئندہ اوراق میں اس کے اکثر اقتباسات سامنے آئیں گے۔ بنظرِ اختصار وہاں اسے صرف "داس گپتا" کے الفاظ سے متعارف کرایا جائے گا۔

اس علمی تگ وتاز کے ماحصل کا جو ہندوستان کے رہنے والوں نے مختلف اطراف وجوانب میں اس قدر طویل عرصہ میں جمع کیا، اس لئے اسے لازماً متضاد عناصر کا مجموعہ ہونا چاہیئے"۔ (صفحہ ۱۲۔۱۱)

یعنی قریب دو ہزار سال کے عرصہ میں ہندوستان کے باشندوں نے مختلف علوم و رسوم سے متعلق جو کچھ جمع کیا اس کا نام ہے وید۔ اس مجموعہ کو زمانہ، اسلوبِ بیان اور موضوع کے اعتبار سے چار اقسام پر منقسم کیا جا سکتا ہے:۔

۱۔ سمہت SAMHITA یا گیتوں کا مجموعہ۔

۲۔ برہمن۔

۳۔ آرنیک۔ ARAN YAKAS

۴۔ اُپ نشد۔

"نثر و نظم کا یہ تمام مجموعہ زمانۂ قدیم میں ایسا مقدس سمجھا جاتا تھا کہ اسے ضبطِ تحریر میں لانا گناہ تصور کیا جاتا تھا۔ اس لئے یہ روایتہً سینہ بہ سینہ برہمنوں کے ہاں منتقل ہوتا رہتا تھا۔ اس اعتبار سے اس کا نام سرتی (روایات یا سنی ہوئی باتیں) ہے"۔ (داس گپتا، صفحہ ۱۲)

چار وید

سمہت کے مجموعہ کے چار حصے ہیں اور ان ہی کو چار وید کہا جاتا ہے، یعنی رگوید، سیام وید، اتھروید، یجروید عام طور پر رگوید کو سب سے پرانا تسلیم کیا جاتا ہے، اگرچہ "پرانوں کی رُو سے سب سے پہلے یجروید تھا۔ اس کو توڑ پھوڑ کر چار وید بنا لئے گئے"۔ (ہندوازم، صفحہ ۹۳) سیام وید کی اپنی حیثیت الگ نہیں۔ اس میں (۷۵) اشلوکوں کے سوا سب کچھ رگوید سے اخذ کردہ ہے۔ یجروید میں بعض حصے رگوید کے ہیں اور بعض اپنے۔ البتہ اتھروید، رگوید سے مختلف ہے اور پروفیسر میکڈونل کی تحقیق کی رو سے "عہدِ کہن" کے تصورات کا مظہر ہے۔ (HISTORY OF SANSKRIT LITERATURE)۔ شروع میں وید ایک ہی تھا، جسے (کہا جاتا ہے کہ) رشی ویاس[1] جی نے چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم سے پہلے ایک زمانہ ایسا بھی آیا، جب یہ وید بالکل ضائع ہو چکا تھا۔ لیکن ایک رشی نے اسے محفوظ رکھا اور اس نے پھر اسے آگے منتقل کیا۔ چنانچہ مہابھارت میں لکھا ہے:۔

"ایک مرتبہ ملک میں بارہ برس تک سخت قحط سالی رہی۔ تمام رشی ویش چھوڑ کر تلاشِ معاش میں کہیں دوسری جگہ چلے گئے اور وید کو قطعاً بھلا بیٹھے لیکن سرسوتی کا بیٹا رشی سرسوت

---

[1] ان کے متعلق تفصیل ذرا آگے چل کر ملے گی۔

اپنے دیس میں رہا اور ایک مچھلی پر گزارہ کرتا رہا جو اس کی ماں (دریائے سرسوتی) اسے روزانہ دے دیتی تھی۔ اس نے وید یاد رکھا اور جب رشی واپس لوٹے تو انہیں دوبارہ یاد کرایا۔"

(ہندوازم، صفحہ ۸۳)

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ان واقعات کو پھر سے سامنے لے آئیے، جن کی رُو سے عزرا نبی نے تورات کو از سرِنو مرتّب کیا تھا اور اودادیرف نے گم گشتہ ژند اوستا کو دوبارہ ترتیب دیا تھا۔

موجودہ وید

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ وید جسے رشی سرسوت نے از سرِنو دوسرے رشیوں کو پڑھایا تھا اور جسے بعد میں رشی ویاس جی نے چار حصوں میں تقسیم کردیا، کیا آج بجنسہٖ ہی ہمارے پاس موجود ہے۔ اس کے متعلق مسٹر گووندداس لکھتے ہیں:۔

"ہم نہایت آسانی سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کتابیں جو آج ہمارے پاس موجود ہیں، ویاس کے مرتب کردہ نسخہ کے مطابق نہیں ہیں۔ اس لئے کہ روایات کی رُو سے ویاس بھی کئی ہو گزرے ہیں اور اس کے علاوہ ویدوں کے کئی اور ترتیب دہندگان، سمہٹ لٹریچر جو آج ہمارے پاس ہے، وہ تو اس مجموعہ کا پانچواں حصّہ بھی نہیں جو آج سے قریب ۲۲۰۰ سال پیشتر مہابھاشا کے زمانہ میں موجود تھا۔" (ہندوازم، صفحہ ۸۴)

یہی صاحب ایک دوسرے مقام پر لکھتے ہیں:۔

"اس سے صاف ظاہر ہے کہ رگوید کی تدوین کے زمانہ میں ہی اصلی منتر (جنہیں رگوید میں علی الحساب اکٹھا کر کے رکھ دیا گیا تھا) کھو چکے ہیں اور ان کی فقط نامکمّل سی یاد ذہنوں میں باقی رہ گئی تھی۔"

(ایضاً، صفحہ ۲۴۹)

تصنیف کا زمانہ

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس سمہٹ لٹریچر (یا ویدوں) کی تصنیف کا زمانہ کون سا ہے۔ یہ مسئلہ اس وقت تک یقینی طور پر طے نہیں ہوسکا اور اس کے متعلق جو کچھ تحقیق کیا گیا ہے، قیاسات پر مبنی ہے۔ اس لئے کہ، جیسا کہ شروع میں لکھا جاچکا ہے، ہندوؤں کے ہاں ان کے عہدِ قدیم کی تاریخ محفوظ نہیں اور جب کسی قوم کی تاریخ محفوظ نہ ہو تو ازمنۂ گذشتہ میں اس کے احوال و کوائف کے متعلق یقینی طور پر کیا کہا جاسکتا ہے؟ بالخصوص جب اس کے ساتھ یہ جذبۂ عقیدت بھی شامل ہو کہ کسی شے کی قدامت

اس کی عظمت کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مثلاً رامائن یا مہابھارت کے واقعات کے متعلق عام طور پر یہ بتایا جائے گا کہ انہیں لاکھوں برس کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اخبار تیج دہلی کے کرشن نمبر مؤرخہ ۷ ستمبر ۱۹۳۹ء میں سوامی انوبھوانند جی لکھتے ہیں:-

"ہماری ہندو جاتی میں سب سے زیادہ برگزیدہ اور متبرک ہستیاں دو ہوئی ہیں۔ ایک مہاراجہ رام چندؑ والیٔ اودھ اور دوسرے بھگوان کرشن والیٔ دوارکا........ ہندو تاریخ کے مطابق رام اور راون کی لڑائی کو آٹھ لاکھ چونسٹھ ہزار سال ہوتے ہیں۔"

جب رامائن کے واقعہ کی قدامت کی یہ کیفیت ہے تو ویدوں کے متعلق ظاہر ہے کہ انہیں کس قدر قدیم قرار دیا جائے گا۔ چنانچہ ویدوں کے متعلق ہندوؤں کا مقدّس عقیدہ یہ ہے کہ زمانہ کی حدود سے ماوراء ہیں، یعنی ازلی ہیں۔ اس سے یہ عقیدہ بھی ان کے ہاں مروّج ہے کہ سنسکرت زبان بھی ازلی اور قدیمی ہے۔ لہٰذا ویدوں کی تصنیف و تدوین کا زمانہ متعیّن کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ آریا، جن کے ہاں وید مروّج تھے، کون لوگ تھے اور ان کی زبان کہاں سے آئی۔

تاریخ ہند میں قیاسات کا رُخ اس طرف جاتا ہے کہ کسی ابتدائی زمانہ میں وسط ایشیا میں ایک قوم رہتی تھی، جس کا ایک حصّہ مشرق کی جانب بڑھا اور کوہِ ہندوکش کے راستے ہندوستان میں داخل ہوا۔ انہوں نے یہاں کے اصل باشندوں کو مفتوح و مغلوب کیا اور گنگا اور جمنا کی وادیوں میں سکونت پذیر ہو گئے۔ ان کا نام آریہ تھا۔ سیامک (جسے ایرانی اپنا پیغمبر مانتے تھے) کا دوسرا نام پارسا تھا۔ اسی کے نام پر ایران کا نام پارس ہوا۔ سیامک کے بعد ہوشنگ کو پیغمبری ملی جس کا دوسرا نام ایران شاہ تھا۔ لہٰذا فارس کا دوسرا نام ایران مشہور ہوا اور اس ملک کے رہنے والے ایرانی یا ایرین یا آریہ کے نام سے موسوم ہوئے۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ لفظ آریا آر کا مادہ ہے، جس کے معنی کاشت کار کے ہیں۔ بہرحال لفظ آریا کی تحقیق کے متعلق خیالات مختلف ہوں تو ہوں لیکن یہ قیاس قریب قریب متفق علیہ ہے کہ یہ قوم وسط ایشیا سے نکل کر ان ہی راستوں سے ہندوستان آئی تھی چنانچہ ڈاکٹر ہنٹر اپنی کتاب تاریخ ہند میں لکھتے ہیں:-

آریہ

ص۱ ایران میں قدیم زمانہ کے بعض ایسے کتبے ملے ہیں، جن میں ایرانی بادشاہوں کے ساتھ آریا کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ مثلاً شاہ گشتاسپ کے نام کیساتھ۔ اسی طرح قدیم یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے ایران کے کئی بادشاہوں کے نام کے ساتھ آریہ کا لفظ لکھا ہے۔

"ہند میں آنے والے آریوں کے اپنے وطن میں رہنے اور وہاں سے جنوب مشرق کی سمت سفر کرنے کا حال ویدوں کے بھجنوں سے بخوبی منکشف ہوتا ہے۔ پہلے بھجن کابل میں درۂ خیبر کے شمال تک پہنچنے اور پچھلے دریائے گنگا تک وارد ہونے کی خبر دیتے ہیں۔"

قدیم ایرانیوں اور ہندوستان کے ان آریوں میں زبان اور عقائد کے اعتبار سے اس قدر اشتراک پایا جاتا ہے کہ ان دونوں کے ایک ہونے (یا کم از کم کسی زمانہ میں اکھٹے رہنے) میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہتی۔ قدیم فارسی زبان کی تین مختلف زبانوں کے نمونے ہمارے سامنے ہیں۔ ایک ژند اوستا کی زبان، دوسرے پہلوی زبان، جو ژند کے بعد مروّج ہوئی تیسرے دری زبان جو پہلوی کے بعد ساسانی عہد میں رائج ہوئی۔ جس قدر مشابہت ژند اوستا کی زبان اور دری زبان میں ہے، اسی قدر مشابہت ژند اوستا اور سنسکرت زبان میں ہے۔ چنانچہ "بعض یورپی علمائے سنسکرت کا قول ہے کہ ویدک گیت کا ہر ایک مصرعہ اوستا کی زبان میں اور اوستا کا ہر ایک جملہ ویدک زبان میں ذرا سی تبدیلی سے مبدل ہو سکتا ہے۔" (مقدمہ تاریخِ ہند قدیم از شاہ اکبر خاں صاحب مرحوم) حتیٰ کہ ژند کی زبان کی طرزِ نگارش یعنی حروف کی شکلیں اکثر سنسکرت کی صورتوں سے مشابہ ہیں۔ چنانچہ ایران میں غیر معروف قدیمی مخروطی حروف میں لکھے ہوئے ایسے کتبے ملے ہیں۔ جن کی زبان سنسکرت سے مشابہ اور ژند اوستا کی زبان ہے۔ ادھر ہندوستان میں ایسے قدیمی سکے ملے ہیں، جن پر قدیمی پہلوی حروف سے مشابہ حروف پائے گئے ہیں جو دائیں جانب سے بائیں جانب کو لکھے گئے ہیں۔ آج بھی فارسی اور سنسکرت زبان میں سینکڑوں الفاظ ایسے ملیں گے ہیں جو آپس میں پوری مشابہت رکھتے ہیں۔ ان حقائق کے پیشِ نظر محققین کی یہی رائے ہے کہ سنسکرت زبان قدیم فارسی زبان سے ہی بنی تھی یا کم از کم یہ کہ دونوں کا ماخذ ایک ہے۔ (آریوں اور ڈراوڑیوں کے اصلی وطن ہندوستان کی طرف انتقال، ان کی زبان اور معاشرت وغیرہ کے متعلق تحقیقاتِ جدیدہ کا رُخ جن اور گوشوں کی سمت پلٹا ہے، اس کا اجمالی ذکر اسی عنوان کے آخیر میں کیا جائے گا) اس اعتبار سے سنسکرت زبان کے قدیمی اور ازلی ہونے کا عقیدہ بلا دلیل ہے۔ چنانچہ مسٹر گووندداس اس باب میں رقم طراز ہیں:-

"یہ مقدس تعلیم کہ سنسکرت دیوبھاشا (یعنی دیوتاؤں کی زبان) ہے اور دنیا میں سب سے قدیم زبان ہے، چپکے سے مسترد کر دینی چاہیئے کیونکہ تاریخ اس دعوے کا کافی بطلان کر چکی ہے۔"

(ہندوازم، صفحہ ۱۴۶)

عقائد کا اشتراک اب رہا عقائد کا اشتراک۔ سو زرتشتی مذہب اور ویدوں کے عقائد کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد انسان لامحالہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ یہ دونوں قریب قریب ایک ہی مذہب کی دو مختلف شکلیں ہیں۔ قدیم آریا جب ایران (یا وسط ایشیا) سے ہندوستان کی طرف آئے تو ظاہر ہے کہ اپنے رسوم و عقائد بھی ساتھ ہی لائے ہوں گے۔ جب ایران میں زرتشت کا ظہور ہوا تو وہاں کے قدیم مہ آبادی مذہب میں بھی تبدیلی ہوگئی۔ ہندوستان کے آریوں کے ایرانیوں کے ساتھ روابط قائم تھے، انہوں نے اس تبدیلی کو بدعت قرار دیا اور اس کے خلاف احتجاج کیا۔ ایران کے شاہ گشتاسپ نے ہندوستان کے سب سے بڑے عالم سنگراچہ یا سنگرانکاچہ کو کہلا بھیجا کہ تم خود آکر زرتشت سے ملو اور شکوک کو رفع کر لو۔ دبستانِ مذاہب میں، اوستا، وساتیر اور سنگرانکاچہ کی تصریحات کے مطابق سنگرانکاچہ اور زرتشت کی ملاقات وغیرہ کا حال تفصیلاً لکھا ہے۔ سنگرانکاچہ زرتشت کا معتقد ہوگیا اور اوستا کا ایک نسخہ لے کر ہندوستان آیا۔ یہاں آکر زرتشت مذہب کو پھیلایا۔ چنانچہ ہزار آدمی اس کے مطیع ہو گئے اور زرتشت کے نام پر ایک تہوار بھی منایا جانے لگا۔ سنگرانکاچہ کے مقابلہ میں یہاں ایک

ویاس جی اور عالم ویاس جی تھے۔ انہوں نے جب یہ کیفیت دیکھی تو زرتشت سے مناظرہ کے لئے بلخ کا سفر اختیار کیا۔ زرتشت سے مناظرہ کے بعد ویاس جی بھی ان کے معتقد ہو گئے اور ان کے مذہب کے مبلغ بن کر ہندوستان واپس آئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے ان متفرق اشعار کو جو اس وقت تک عام لوگوں میں منتشر تھے، جمع کیا اور اپنے جدید مسلک کو ان میں شامل کر کے وید مرتب کیا۔ ویاس جی کے متعلق خود ہندوؤں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ وہ وید کے مرتب کرنے والے ہیں۔ اس پس منظر کے بعد یہ حقیقت اچھی طرح سے واضح ہو جاتی ہے کہ ویدوں کے عقائد و رسوم اور زرتشتی مذہب میں اس قدر مشابہت کیوں پائی جاتی ہے۔ مذہب زرتشت میں آگ کی پرستش ہوتی ہے۔ ویدوں کی رُو سے بھی اگنی قابلِ پرستش دیوتا ہے۔ رگوید منڈل ۷ سوکت ۱، ۶، رچا ۶، ۷ میں ہے:-

"اگنی امرت کا مالک ہے، دولت کا مالک ہے، وہی مستحکم خاندان دینے والا ہے۔ اے خدائے باقوت ایسا نہ کر کہ ہم تیرے غلام بلا اولاد، بلا خوبی اور بغیر چڑھاؤں کے رہ جائیں۔ کیا ہم نیک اگنی کی نعمتوں سے گھرے ہوں گے؟ کیا ہمیں دائمی دولت ملے گی؟ او اگنی! ہم کسی غیر قوم سے نہیں نکلے ہیں۔ تو وہی راستہ لے جو تجھے ہمارے پاس پہنچا دے۔ اگر صرف وہی خون نہ ہو جو ہم میں ہے تو پھر اگنی کو چڑھاوے کہاں سے ملتے اور کون اس کی پرستش کرتا۔ اسے پورا حق

اس مکان میں رہنے کا ہے، جسے ہم نے اس کے لئے خاص کیا ہے۔ آ ہمارے پاس اے قومی
فتح مند اور پرستش کے لائق دیوتا۔

پھر یہ بھی دیکھئے کہ وید میں جو مفہوم منتر کا ہے، وہی مفہوم اوستا میں منتھر کا ہے۔ اوستا میں جس چیز کو ہوما کہا گیا ہے اس کو وید میں سوما کہا گیا ہے۔ ژند اوستا میں مترا یا متھرا بہت بڑا قابلِ تعظیم "خدا" ہے۔ (تفصیل اس کی پہلے گزر چکی ہے) اس کے متعلق لکھا گیا ہے کہ "وہ ہمیشہ سچ بولتا ہے۔ اس کے ایک ہزار کان، دس ہزار آنکھیں اور ہمیشہ بلا اونگھے خلقت کی عافیت کی نگرانی کرتا ہے۔" رگوید منڈل ۳، سوکت ۵۹ میں اسی مترا کے متعلق لکھا ہے کہ "مترا قوموں پر ہمیشہ بلا آنکھ بند کئے نظر رکھتا ہے۔ مترا کے آگے گھی کے ساتھ نذر دلاؤ" ژند اوستا میں جس فرشتہ اریمن کا

وید اور زرتشتی تعلیم

ذکر ہے، اسے رگوید منڈل ۱، سوکت ۱۳۶ میں ارمن دیوتا کہہ کر پکارا گیا ہے۔ ژند اوستا کے مذہب میں سورج کی بڑی تعظیم ہے۔ اسی طرح رگوید میں سورج کو دیوتا قرار دیا گیا ہے۔ وایو دیوتا، ژند اوستا اور رگوید دونوں میں موجود ہے۔ اوستا میں تھری تلب سے پہلا حکیم بیان کیا گیا ہے۔ رگوید اور اتھروید میں ترتیا کو بیماریوں کو اچھا کرنے والا دیوتا کہا گیا ہے۔ قربانی چڑھانے والوں کو ژند اوستا میں اتھروہ اور ویدوں میں اتھرون کہا گیا ہے۔ ان کے علاوہ قربانیوں کے طریقے اور عبادت کے وقت کی دعائیں پارسیوں کی کتابوں اور ویدوں میں بہت ملتی جلتی ہیں۔ ہندو جسطرح ایک خاص عمر میں لڑکے کے گلے میں زنار کا تاگہ ڈھالتے ہیں، ایرانی بھی اسی طرح ڈالتے تھے۔ ژند کی زبان میں ہوم کے معنی آگ جلانا اور اس میں کچھ چیزیں ڈالنا ہے۔ اسی کو ہندو ہون کہتے ہیں۔ آتش پرستوں کے صبح و شام کے گانے کے منتروں کو گاتھا کہتے ہیں۔ ہندو اس قسم کے منتروں کو گائتری کہتے ہیں۔ یہاں جس طرح موسم سرما کی آمد پر دیوالی کا تہوار مناتے تھے، ایران میں آتش پرست، آتش سوز یا چراغاں کا تیوہار مناتے تھے۔ یہاں جو کچھ ہولی کے تیوہار پر ہوتا ہے، وہی کچھ آتش پرستوں میں "کوسہ برنشین" تیوہار میں ہوتا تھا۔ یہاں بسنت کا تیوہار وہی ہے جو آتش پرستوں میں "جشنِ گل کوبی" تھا۔ ہندو دھرم کی بنیاد ورنوں (ذاتوں) کی تقسیم پر ہے، یہی تقسیم ایرانیوں میں موجود تھی۔ اول برمان (زہاد و علماء) ان کو یہاں برہمن کہا جاتا ہے۔ دوم چترمنی (بادشاہ، یا پہلوان جن کے چتر، سائبان کی حفاظت میں زندگی بسر کی جائے) یہی یہاں کے چھتری ہیں۔ سوئم باس یا بیش (تاجر و کاشت کار) جنہیں یہاں ویش کہہ کر پکارا جاتا ہے۔ چہارم سوین یا سود (خدمت گار) یہ یہاں کے شودر ہیں۔ ان ہی چیزوں کے پیشِ نظر محققین اب اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ:-
وید صاف طور پر زرتشت کی تعلیم کے میہمن ہیں۔ (RESEARCHES IN ORIENTAL HISTORY_P.131)

آریوں کے اصل مسکن، ان کی نقلِ مکانی، ایرانیوں اور آریوں کے باہمی روابط وضوابط اور مذہبِ زرتشت اور ویدک دھرم کی مشابہت ومماثلت کے پیشِ نظر ویدوں کی، تصنیف وتدوین کے زمانہ کے تعیّن کے لئے کچھ دھندلی سی تاریخی روشنی مل جاتی ہے۔ اگرچہ مسٹر بال گنگادھر تلک ان کی تصنیف کا زمانہ ۴۰۰۰ سنہ ق.م ----------

ویدوں کا زمانہ تصنیف

اور مسٹر ہاگ HAUG قریب ۲۴۰۰ سنہ ق.م قرار دیتے ہیں، لیکن پروفیسر میکس مُلر (MAX MULLER) کی تحقیق کی رُو سے ان کا زمانہ زیادہ سے زیادہ ۱۲۰۰ سنہ ق.م قرار دیا جاسکتا ہے۔ پروفیسر مُلر ویدوں کے عہد کو چار حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

۱۔ سوتر لٹریچر ۲۰۰ سنہ سے ۶۰۰ سنہ ق.م تک

۲۔ براہمن ۶۰۰ سنہ سے ۸۰۰ سنہ 〃 〃

۳۔ منتر ۸۰۰ سنہ سے ۱۰۰۰ سنہ 〃 〃

۴۔ چھند (رگوید کے آخری حصہ سمیت) ۱۰۰۰ سنہ سے ۱۲۰۰ سنہ 〃 〃

ویدوں میں بالعموم رگوید کو سب سے قدیم قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے متعلق ڈاکٹر داس گپتا لکھتے ہیں:۔

"رگوید کے منتر نہ تو کسی ایک شخص کی تصنیف ہیں، نہ کسی ایک زمانہ کی۔ یہ منتر غالباً مختلف زمانوں میں مختلف رشیوں نے تصنیف کئے اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ ان میں سے بعض منتر آریوں نے ہندوستان میں آنے سے پیشتر تصنیف کئے ہوں۔ یہ منتر تمام سینہ بہ سینہ چلے آتے تھے اور ہر زمانہ کے شاعر ان میں رفتہ رفتہ اضافہ کرتے رہتے تھے۔ غالباً جب مجموعہ بہت ضخیم ہوگیا تو اسے موجودہ شکل میں مدوّن کیا گیا۔ اس لئے ان میں دراصل آریوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے اور بعد کے زمانہ کی ترقی کے مختلف ادوار کی جھلک دکھائی دیتی ہے اور عہدِ قدیم کی اس سوسائٹی کے انداز واطوار کا پتہ چلتا ہے۔ جس نے انہیں تصنیف کیا۔" (صفحہ ۱۵)

کیسے تصنیف ہوتے

اس سے ظاہر ہے کہ وید دراصل کیا ہیں اور ان کی تصنیف کس طرح ہوئی۔ یعنی مختلف زمانوں میں مختلف شاعروں نے (جس قسم کے شاعر اس زمانۂ قدیم میں ہو سکتے تھے) اپنے ماحول، معاشرہ، بودوباش، رسوم وروایات، قصص وحکایات کے متعلق

جو کچھ نظم کیا۔ وہ آریوں کی خانہ بدوشی کی زندگی اور بعد میں کاشت کاری کے زمانہ میں زبان زدِ خلائق تھا (جس طرح قدیم زمانہ کے بعض منظوم قصّے آجکل بھی دیہات میں مروّج ہیں) بعد میں ویاس جی نے ان میں اپنے مسلک و خیالات کا اضافہ کر کے انہیں مدوّن کر دیا۔ ہو سکتا ہے کہ ان میں بعض تعلیم الہامی بھی ہو لیکن نہ تو تاریخ اس کے متعلق کچھ بتا سکتی ہے اور نہ ہی جس مسخ شدہ صورت میں وہ آج ہمارے سامنے ہے، اس سے اس کے متعلق حتمی طور پر کچھ کہا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی شہادت خود ہندوؤں کی مقدّس کتاب مثل پوران سے ملتی ہے۔

"اس ایک وید میں متعدد بار تحریف ہوئی ہے....... رشیوں کی نسلوں نے اس میں نگاہ کی خرابی اور دل کی لغزش کی وجہ سے بہت سی اختلافی چیزیں داخل کر دیں۔ منتروں، برہمنوں اور کلپ سوتروں کے نسق میں بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں اور رگ، یجر اور شام وید بار بار مدوّن ہوئے۔ پہلے یجر ایک ہی تھا، پھر اس کے دو حصّے ہو گئے۔ اسی طرح دواپرا زمانہ میں تینوں ویدوں میں خلفشار واقع ہو گیا۔" (بیتا پوران بحوالہ ہندوازم ص ۹۰)

تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آ گئی کہ وید کسی ایک زمانہ کی تصنیف نہیں بلکہ عرصۂ دراز پر پھیلے ہوئے لٹریچر کا مجموعہ ہیں جو سینہ بہ سینہ چلا آتا تھا۔ اس میں مرورِ زمانہ سے ردّ و بدل بھی ہوتا رہا اور حک و اضافہ بھی۔ ویاس جی کے زمانہ میں جو کچھ ان کے سامنے تھا، اسے ایک جگہ مدوّن کیا گیا لیکن اس کے بعد بھی اس میں برابر تحریف ہوتی رہی۔ چنانچہ مسٹر گووند داس اس حقیقت کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں:-

"اس تمام بیان سے یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے (جسے اکثر اوقات دیدہ دانستہ نظر انداز کر دیا جاتا ہے) کہ ہندومت آہستہ آہستہ مختلف زمانوں میں اپنی خصوصیات کو ادلتا بدلتا رہا۔ کسی خاص زمانہ کو منتخب کر کے اس مذہب اور اس کی رسوم کو سناتن (ازلی) کہنا ایک مقدّس فریب ہے۔" (ہندوازم، صفحہ ۲۷)

وید کب تحریر میں آئے

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب وید سینہ بہ سینہ آگے منتقل ہوتے چلے آ رہے تھے تو پھر یہ ضبطِ تحریر میں کب آئے۔ اس لئے کہ وہی تحریر شدہ نسخہ ــــ جس سے یہ سلسلۂ نقل و کتابت آگے بڑھا، قابلِ اعتماد سمجھا جا سکتا ہے۔ مثلاً آج ویدوں کا ایک مطبوعہ نسخہ آپ کے سامنے آتا ہے۔ اس سے فوراً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ نسخہ کس نسخہ سے نقل کیا گیا ہے۔ اسی طرح اس سلسلہ کو پیچھے کی طرف لوٹایا جائے تو بالآخر کسی ایک نسخہ تک پہنچنا پڑے گا۔ جس سے

یہ سلسلہ آگے بڑھا تھا لیکن یہاں بھی وہی مشکل ہے جو ویدوں کی زبان کے مسئلہ میں لاحق ہو رہی تھی، یعنی زبانِ تاریخ اس کے متعلق بھی خاموش ہے اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ وہ مستند نسخہ جس سے یہ سلسلہ آگے بڑھا، کون سا، اور کہاں ہے؟ اس کے ساتھ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہندوستان میں تحریر کا رواج کب سے شروع ہوا۔ پروفیسر میکس مُلر (جو سنسکرت زبان کا مشہور عالم اور محقّق گزرا ہے) کی تحقیق یہ ہے کہ ہندوستان کے مشہور جغرافیہ نویس پانِنی کے زمانہ تک اس ملک میں کوئی شخص فنِ تحریر سے واقف نہ تھا۔ پانِنی کا زمانہ اس مستشرق نے ۳۵۰ ق م مانا ہے لیکن ڈاکٹر بوہلر نے پانِنی کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح قرار دیا ہے[1]۔

ڈاکٹر ڈیویڈس نے اپنی کتاب BUDHIST INDIA میں لکھا ہے کہ ڈراوڈی تاجر قریب سات آٹھ سو سال قبل مسیح میں عراق عرب سے سامی حروف لائے اور ان ہی حروف کی مدد سے یہاں فنِ تحریر کی ابتدا ہوئی لیکن مذہبی کتابوں کی تحریر کا رواج بدھوں کے عہدِ حکومت سے پہلے نہیں ہوا۔ ادھر اگر ویاس جی کو ویدوں کا مرتب تسلیم کر لیا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ وہ سب سے پہلے ویدوں کو حیطۂ تحریر میں لائے۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، پارسیوں کے دساتیر سے، ویاس جی کے زرتشت کے پاس جانے کا حال معلوم ہوتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وید سب سے پہلے قریب چھ سو سال قبل مسیح میں تحریر میں لائے گئے (کیونکہ یہی زمانہ جنابِ زرتشت کا قرار دیا جا سکتا ہے) لیکن ویدوں کو لکھنے کا رواجِ عام اس زمانہ میں نہیں ہوا۔ حتیٰ کہ البیرونی نے اپنی کتاب الھند میں لکھا ہے کہ اس زمانہ میں بھی ویدوں کو ضبطِ تحریر میں لانے کی اجازت نہیں دی جاتی تھی اور اس کے ہندوستان میں آنے سے کچھ عرصہ پہلے (سنہ ۱۰۰۰ء) میں ایک کشمیری پنڈت نے ویدوں کو کتابی صورت میں لکھا تھا لیکن آج اس نسخہ کا بھی کسی کو علم نہیں کہ کیا ہوا۔ بہر حال اس امر کے متعلق یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ویدوں کا سب سے پرانا نسخہ کونسا ہے اور وہ کہاں ہے؟

ویدوں کے مصنّف کون تھے؟

اس کے بعد یہ سوال سامنے آتا ہے کہ ویدوں کو تصنیف کس نے کیا؟ ظاہر ہے کہ جب تاریخ کی رُو سے ویدوں

---

[1] مسٹر گووِنداس لکھتے ہیں کہ "اس امر کے ثبوت کے لئے کوئی دلیل نہیں ملتی کہ ۱۰۰۰ قبل مسیح سے پیشتر ہندوستان میں تحریر کا رواج تھا۔" ہندوازم، صفحہ ۱۵۳)

کی تصنیف کا زمانہ ہی متعین نہیں ہو سکتا تو ان کے مصنفین کا تعین کس طرح ہو سکتا ہے! لیکن خود ویدوں میں جن مصنفین کے نام موجود ہیں، ان ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ کس کی تصنیف ہیں۔ ویدوں کا انداز یہ ہے کہ ہر ایک منتر کا کوئی نہ کوئی رشی اور کوئی نہ کوئی دیوتا ہوتا ہے۔ متکلم کا نام رشی ہوتا ہے اور مخاطب یا موضوعِ سخن کا نام دیوتا۔ یہی رشی ان وید منتروں کے مصنف سمجھے جاتے ہیں۔ چنانچہ وید منتروں میں ان رشیوں کے نام موجود ہیں۔ مثلاً رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۶۳ منتر ۱۷ میں رشی کا نام پلت کا بیٹا گئے لکھا ہے۔ رگوید منڈل ۳ سوکت ۳۳ منتر ۵ کا رشی کشک کا بیٹا وشوامتر ہے۔ جو منتر کو اس طرح شروع کرتا ہے۔ "میں وشوامتر جو کشک کا بیٹا ہوں"۔ رگوید منڈل ۱، سوکت ۱۷۹ منتر ۴ کی مصنفہ کا نام لوپامدرا ہے، جو اپنا حال یوں بیان کرتا ہے:-

بدنامی برہمچاری رشی نے کہیں سے اچانک آکر مجھ سے .... زبردستی کی، لوپامدرا سسکیاں لے لے کر فریاد کرتی ہے"۔

رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۸۵ کی رشی (مصنفہ) سوریا ساوتری ہے جو اس سوکت میں اپنی شادی کا حال لکھتی ہے۔ رگوید منڈل ۸، سوکت ۱۹، منتر ۳۶ کا رشی سوبھری کنو لکھتا ہے:-

"پروکتس کے بیٹے ترس وسیو راجہ نے مجھ رشی کو سواستوندی کے تیرتھ پر پچاس رانیاں اور ۲۱۰ کالے رنگ کی گائیں خیرات دیں"۔

اسی طرح تمام ویدوں میں رشیوں کے نام اکثر و بیشتر منتروں میں درج ہیں۔ یہ تو رہے انسان رشی، اس سے آگے بڑھئے تو رگوید منڈل ۸ سوکت ۶۸ منتر ۵ میں جال میں پھنسی ہوئی مچھلیاں اپنا حال بیان کرتی ہیں اور اپنی رہائی کے لئے آدیتہ دیوتا کو مدد کے لئے بلاتی ہیں۔ رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۰۸ منتر ۱۱-۲ کی رشی، دیوتاؤں کی کتیا سرما نامی ہے، جسے اندر دیوتا نے ہر ہسپتی کی مسروقہ گایوں کا کھوج نکالنے کے لئے اسروں کے پاس بھیجا تھا۔ دوسری جگہ (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۴ منتر ۱۱-۱۰ میں) اس کتیا کے پلوں کا حال یوں لکھا ہے:-

"اے سرما کے دو پلو، چار چار آنکھوں والو اچھے راستے سے یہاں آؤ، جو تیرے یم کے محافظ چار آنکھوں والے دو کتے ہیں"۔

عجیب و غریب رشی

کسی جگہ وید منتروں کا رشی کبوتر ہے۔ (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۶۵ منتر ۱) اتھر وید کانڈ ۱۹ سوکت ۶ منتر ۱ کا رشی نیل کنٹھ ہے۔ سام وید میں ایک رشی توا شٹا کا بیٹا تین سروں والا لکھا ہے۔ شت پت براہمن میں (جسے ویدوں کی الہامی تفسیر مانا جاتا ہے۔)

اس کا حال یوں درج ہے :۔

"اس کے تین سر اور چھ آنکھیں تھیں، ایک منہ سوم پیتا تھا، دوسرا شراب پیتا تھا اور تیسرا اناج کھاتا تھا...... اس سے اندر نے لڑائی کی اور اس کے تینوں سروں کو کاٹ ڈالا۔ وہ جو سوم رس پینے والا منہ تھا، اس سے کوا پیدا ہوا اور جو شراب پینے والا منہ تھا، اس سے کال کلینچی پیدا ہوئی...... اور جو کھانا کھانے کے لئے منہ تھا اس سے تیتر پیدا ہوا۔"

رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۹۴ کا رشی کدور کا بیٹا اربد نامی سانپ[1] لکھا ہے۔ حتیٰ کہ رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۳۴ کا رشی جوئے کا پانسہ ہے۔ چنانچہ مہارشی یاسک اچاریہ جی مہاراج ویرانگ نرکت (۹/۱/۸) میں لکھتے ہیں کہ :۔

"یہ منتر یا سوکت اُلٹے پڑے ہوئے جوئے کے پانسے کا کلام ہے۔"

رگوید منڈل ۳ سوکت ۳۳ منتر ۶-۳ و ۳-۸ کے رشی، ستلج اور بیاس دریا ہیں جو شوامتر سے باتیں کرتے ہیں۔

تصریحات بالا سے ظاہر ہے کہ وید منتر مختلف لوگوں کی تصنیف ہیں اور ان میں انسانوں کے علاوہ پرندوں، جانوروں، درختوں، پہاڑوں، دریاؤں کی زبان سے بھی بہت سی باتیں درج ہیں۔ اس الجھاؤں کے پیش نظر ویدش کے ہندو عالم حیرت میں رہ جاتے ہیں کہ انہیں الہامی (یا خدا کا کلام) کیسے مانا جائے۔ چنانچہ گورو کل مہادیالہ جوالاپور کے سکھیہ پنڈت نرودیو شاستری ویدتیرتھ اپنی تصنیف رگوید آلوچن ص ۶۱ پر لکھتے ہیں :۔

"کئی سوکتوں میں امک (فلاں) کے پتر امک (فلاں) نے اس سوتر (سوکت) کو رچا بنایا۔ ایسا سپشٹ (صریح) لیکھ (لکھا) ہے۔"

جس کے پیش نظر وہ ص ۱۹۷ پر لکھتے ہیں کہ :۔

"جب ہم برہم وادی پکش (ویدوں کے الہامی ہونے) کی درشٹی (نقطۂ نگاہ) سے ارتھ (غور) کرنے لگتے ہیں تو کہیں کہیں منتروں میں ایک کٹھنتا (مشکل) آپڑتی ہے۔ وہ یہ کہ کہیں کہیں منتر ورشٹا رشی

---

[1] "انسان کا بیٹا سانپ" وجہ تعجب نہیں ہونا چاہیئے۔ سوامی دیانند نے ستیارتھ پرکاش میں (ص ۴۱۹ پر) اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ۔ "ایسا ہی بھاگوت میں لکھا ہے کہ اونی کے بطن سے آدیتہ، دنتا کے بطن سے پرندے، کدور کے بطن سے سانپ، سرما کے بطن سے کتے، گیدڑ وغیرہ اور دیگر عورتوں کے بطن سے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، گدھے، بھینسے، گھاس پھونس اور ببول وغیرہ کے درخت کانٹوں سمیت پیدا ہوئے۔

(منتر بنانے والے رشی) کا نام ہی منتر میں مل جاتا ہے۔ تب سندیہہ (شبہ) ہوتا ہے کہ یہ کیا بات ہے؟"

وید الہامی کتاب نہیں

انہی اشکال کی بناء پر ہندوؤں کے بڑے بڑے وِدوان (علماء) اس اعتراف پر مجبور ہو گئے کہ وید الہامی نہیں ہیں۔ چنانچہ ویدوں کے عالم اور براہمن گرنتھوں کے مترجم پنڈت ستیہ ورت شری اپنی کتاب ترئی پریچے (ص۴۷) پر تسلیم کرتے ہیں کہ:۔

"ایسے ہی بلاشک و شبہ یہ بات صحیح ہے کہ ہمارے بزرگ رشیوں ہی نے ویدوں کو تصنیف کیا تھا۔"

اسی طرح پنڈت نردیو شاستری (جن کا ذکر اوپر آچکا ہے) اپنی کتاب رگوید آلوچن کی بھومکا (تمہید) میں مسٹر تلک کے متعلق لکھتے ہیں کہ:۔

"تلک بھی برہم وادی پکش (ویدوں کے الہامی ہونے کے عقیدہ کا کھنڈن (تردید) کرتے ہیں۔"

یہی پنڈت جی اپنے گرو پنڈت سام شری کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"سام شری پکش ورتمان (موجودہ) ویدوں کو بھارتیوں (ہندوستانیوں) کے لئے ہی مانتے ہیں۔ ویدوں کو ایشوری گیان (علمِ خداوندی) نہیں مانتے۔ ان کو آریہ ورتی آریوں کی سبھیتا (تہذیب) کا اتہاس (تاریخ) مانتے ہیں۔"

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی کتاب 'THE DISCOVERY OF INDIA' میں لکھتے ہیں:۔

"بہت سے ہندو ویدوں کو الہامی کتاب سمجھتے ہیں۔ یہ میرے نزدیک ہماری بڑی بدقسمتی ہے۔ کیونکہ اس طرح ان کی حقیقت ہم سے اوجھل ہو جاتی ہے۔ وید صرف اس زمانہ کی معلومات کا مجموعہ ہیں۔ وہ بہت سی چیزوں کا غیر مرتب شدہ ذخیرہ ہیں۔ دعائیں، قربانی کی رسومات، جادو، نیچرل شاعری وغیرہ۔" (صفحہ ۵۷)

حقیقت بھی یہی ہے کہ وید دراصل آریوں کی قدیم زندگی کی معاشرت کی تاریخ ہیں۔ چنانچہ پنڈت کرشن کمار بھٹاچارج سابق پروفیسر سنسکرت، پریذیڈنسی کالج کلکتہ لکھتے ہیں:۔

"رگوید ایک کتاب ہے جو ایک ایسی قوم کی حالت بیان کرتی ہے جو بلاشبہ حالتِ خانہ بدوشی سے بہت ترقی کر چکی تھی، اس میں شہروں کا، دیہات کا اور بادشاہوں، قمار خانوں اور کسبیوں کی کئی ایک دوسری علامات کا ذکر ہے جو کہ حالت خانہ بدوشوں میں نہیں پائی جاتیں۔ رگوید کے دوسرے حصے

ان کے شاعروں یا رشیوں نے اس ملک میں تصنیف کئے۔ رگوید مختلف ملکوں میں لکھا گیا۔ جن میں ایک دوسرے سے بہت عرصہ کا فرق ہے۔ ہمارے بزرگوں نے جو خانہ بدوشی کی زندگی بسر کی ہے، اس کی نسبت علمِ ہنود (سنسکرت) کی نہائیت ہی قدیم کتابوں میں اس قدر کم اشارات ملتے ہیں کہ فقط رگوید کے مطالعہ سے ہم اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ ایسا ہی ہوگا کیونکہ گایوں کی بازیافت، گایوں کی لوٹ، گایوں کی ترقی تعداد اور گایوں کی بخششیں، اس کتاب کے مضامین ہیں اور کئی طریقوں سے اس بات پر زور دیا گیا ہے۔ جس سے ایک بے تعصب پڑھنے والے کو بھی یہی نتیجہ نکالنا پڑتا ہے کہ یہ بیانات، حالاتِ خانہ بدوشی کا ذکر کر رہے ہیں جو یا تو فی الحقیقت اس وقت موجود تھی، یا جس کو گزرے ہوئے بہت عرصہ گزر چکا تھا۔ ان اصولوں کی نسبت جو اس زمانہ میں مروج تھے، رگوید ذرا بھی ہماری رہنمائی نہیں کرتا۔ اس بارہ میں ان ایک ہزار بھجن کی مثال ایک لق ودق اور ہولناک بیابان کی سی ہے، جس میں جدھر نگاہ کرو، ببول کے کانٹوں اور خاردار جھاڑیوں کے سوا اور کچھ نظر نہ آئے۔ پرمیشر کی اس اناوی گیان (علمِ ازلی یعنی رگوید) کی چند ایسی سوکتیں ہیں، جن کا خطاب گھی، گائے اور کھتین کی طرف ہے اور جن میں ایک ہارے ہوئے قمار باز کی ناامیدی کا ذکر ہے۔ دوسری سوکتوں میں ہم بے شمار جادو اور منتر پاتے ہیں جو بیماری کے دفیعہ، عشق، لڑائی یا قمار بازی میں پوری کامیابی حاصل کرنے کے لئے یا تو ایک آدمی کو خود یا اس کے لئے کسی جادوگر کو پڑھنے چاہئیں .... اتھر وید میں چھوٹی چھوٹی مصیبتوں، مثلاً پسوؤں، جوؤں وغیرہ کے دفیعہ کے لئے اور ایک گنجے کے سر پر بال پیدا کرنے کے لئے معقول ہدایات لکھی ہیں اور بے معنی ہذلیات بھی لکھی ہیں۔ مثلاً جارو گوا کمبل کے سلیپر (ڈھیلی جوتی) پہنے ہوئے دروازے پر کھڑا ہے اور اسینس دے رہا ہے۔ جناب مہربانی کر کے بتلائیے کہ نئے چاند کے روز ملاقات کرنے سے کیا فائدہ وغیرہ۔"

(ویدوں کی قدامت از مولانا اکبر شاہ خاں مرحوم)

حتی کہ ویدوں کی زبان کے متعلق بھی تحقیق ہے کہ وہ نقائص سے خالی نہیں۔ چنانچہ گورو کل کانگڑی کے پروفیسر پنڈت چندر منی، ودیا النکار، اپنے ترجمہ نرکت حصہ اول صہ ۹۶ پر لکھتے ہیں:۔

"پرماتما پورن (مکمل) ہے۔ یدی (اگر) وید، پرماتما کے دیے ہوئے ہیں تو اس کی بھاشا (زبان) میں اس اپورنتا (نقص یا ادھورے پن) کا مہادوش (عظیم الشان غلطی) نہیں ہونی چاہئے .... یہ

آشنکا (اعتراض) ہمیں بہت ڈگمگاتا ہے۔ ویدک بھاشا میں اتنی بھاری ترٹی (کمزوری۔ خرابی) کا ہونا بڑا کھٹکتا ہے۔"

ویدوں کی تعلیم

اب ہم اس مرحلہ کے نازک ترین حصّہ پر پہنچ رہے ہیں۔ یعنی سوال یہ ہے کہ ویدوں کی تصنیف وتدوین کی تاریخ اور ان کے مصنّفین سے قطع نظر دیکھنا یہ ہے کہ وید جس حالت میں بھی آج دنیا کے سامنے ہیں، ان کی تعلیم کیا ہے؟ یعنی اب اسناد کو چھوڑ کر متن 'TEXT' کی طرف آنا چاہیئے۔ اور دیکھنا چاہیئے کہ اس سے ہم کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ ہم نے جس وقت سے عنوان زیرِ نظر لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا (بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس سے بھی قبل، جب یہ مضمون "ہنوز اندر طبیعت می خلد" کے دور میں تھا) ہم اس کش مکش میں غلطاں وپیچاں ہیں کہ ویدوں کی تعلیم کو سامنے لانے کے لئے ان کے اقتباسات دیئے جائیں یا نہ۔ آپ سوچتے ہوں گے کہ اس میں آخر کش مکش واضطراب کی کون سی بات ہے لیکن یہ خیال آپ کے دل میں اس لئے آرہا ہے کہ آپ نے ویدوں کو پڑھا نہیں۔ (حقیقت یہ ہے کہ خود ہندوؤں میں بھی سوائے ان کے بڑے بڑے ودوان ہندوؤں کے شاید ہی کسی نے ویدوں کا مطالعہ کیا ہو) ویدوں میں ایسی ایسی باتیں ہیں کہ انہیں سامنے لانے کا خیال کیا جائے تو شرم وحیا اس طرح دامنگیر ہوجاتی ہے کہ آگے قدم بڑھانے کی ہمت ہی نہیں پڑ سکتی۔ ہمیں اس امر کا احساس ہے کہ ویدوں کی صحیح تعلیم کا اندازہ نہیں ہوسکتا، جب تک ان کے اقتباسات سامنے نہ آجائیں، لیکن ہم قارئین کے ذوقِ سلیم کی لطافت کو اس ضرورت پر قربان کرنے کی جرأت نہیں کرسکتے۔ اس لئے مجبوراً فیصلہ یہی کیا گیا ہے کہ اس قسم کے اقتباسات کو چھوڑ کر محض اشارات پر اکتفا کیا جائے۔ ذرا غور کیجئے۔ پرنسپل گرفتھ نے ویدوں کا ترجمہ کیا ہے۔ اوّل تو مترجم کی حیثیت سے ان کا فرض تھا کہ جو کچھ بھی ان کے سامنے آئے، اس کا ترجمہ کرتے جائیں۔ پھر اہلِ مغرب کا انداز ایسا ہے کہ جن باتوں کو ہم لوگ بڑی جھجک اور تأمل سے کہتے ہوئے بھی ہچکچاتے

مشکل اندر مشکل

ہیں، وہ نہایت آزادی اور بے باکی سے کہہ جاتے ہیں۔ اس کے باوجود ویدوں میں ایسے مقامات آجاتے ہیں، جہاں گرفتھ صاحب کو بھی کہنا پڑتا ہے کہ مجھ میں ان کا ترجمہ سامنے لانے کی ہمت نہیں پڑتی۔ مثلاً یجروید ادھیائے ۲۳ منتر ۲۸-۱۹ پر پہنچ کر (جہاں یجمان کی بیوی کا گھوڑے سے .... کی کیفیات درج ہیں) گرفتھ صاحب قلم رکھ کر بیٹھ جاتے ہیں اور کہتے ہیں تو فقط اتنا کہ

"یہ اور اگلے نو منتر اس قابل نہیں کہ انہیں یورپ کی کسی علمی زبان میں دھندلی سی شکل میں بھی پیش کیا جا سکے۔"

یہ تو تھا ایک انگریز مترجم۔ اب خود ہندوؤں کی زبان سے اس حقیقت کا اعتراف سنیئے۔ نکاح ایک مقدس رسم ہے، جس سے انسان کی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس رسم میں انسان کو اس کی نئی زندگی کی ذمہ داریوں حقوق و فرائض اور ــــــــــــ میاں بیوی کے تعلقات و روابط کی یاد دلائی جاتی ہے۔ خطباتِ نکاح اور اور ایجاب و قبول ان ہی مقاصد کو لئے ہوتے ہیں۔ دنیا کی ہر قوم اور ہر مذہب میں اس مقدس پیمان کی توثیق کے لئے کچھ نہ کچھ کہلوایا جاتا ہے۔ ہندوؤں کے ہاں اس تقریب پر وید کے اشلوک پڑھے جاتے ہیں۔ وہ اشلوک کیا ہیں؟ ان کا ترجمہ تو ہم (اس دقت کے ماتحت، جس کا تذکرہ کیا جا چکا ہے) پیش نہیں کر سکتے لیکن ان کے متعلق خود ہندوؤں کے سمجھدار طبقہ کی آرا پیش کر سکتے ہیں۔ پنڈت گنگا پرشاد اپادھیائے (ایم۔اے) پردھان آریہ سماج الٰہ آباد۔ اخبار آریہ منتر، بابت ۶ جون ۱۹۲۹ء میں اس موضوع پر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:۔

"وہ (رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۸۵، منتر ۳۸) منتر اتنا اشلیل (گندہ) ہے کہ سادھارن (معمولی) سنسکرت جاننے والا در (دولہا) بھی اسے پڑھنے کا ساہس (حوصلہ) نہ کرے گا۔ ابھی تو لوگ اس لئے پڑھ دیتے ہیں کہ نہ پڑھنے والا سمجھتا ہے نہ سننے والے۔ پرنتو (مگر) کیا آریہ سماج سَرْدا (ہمیشہ) یہی اوستھا (حالت) رکھنی چاہتا ہے؟ یدی (اگر) اس منتر کو نہ نکالا گیا تو اس کے وِردھ (خلاف) یا تو بھیانک وِردھ (خوفناک مخالفت) ہوگی، یا لوگ اسے اپیکشا کی درشٹی سے (بنظرِ حقارت) دیکھ کر چھوڑ دیا کریں گے۔ دونوں ہی باتیں انشٹ (بُری) ہیں۔"

آریہ سماج میں پوری کے پردھان بابو شیام سندر لال جی نے بھی اپنے مضمون مطبوعہ اخبار آریہ منتر آگرہ (بابت ۵ ستمبر ۱۹۲۹ء) میں اس کی تائید کی ہے۔ چنانچہ سوامی سوتنترانند جی مہاراج نے اس منتر (نیز اسی قسم کے دوسرے منتروں) کو اسی بناء پر سوامی دیانند جی کی تصنیف سنسکار ودھی سے نکال کر سوامی جی کے نام سے ایک نئی سنسکار ودھی شائع کر دی ہے۔ (بحوالہ ویدارتھ پرکاش صفحہ ۱۱۸)

ان تصریحات سے آپ ہماری ان مشکلات کا اندازہ کر سکتے ہیں، جن کی طرف شروع میں اشارہ کیا گیا ہے۔ ہم ایک مرتبہ اس حقیقت کو پھر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ ان چیزوں کے تذکرہ سے ہمارا مقصود کسی کی دل آزاری قطعاً نہیں۔ مقصود فقط یہ ہے کہ ویدوں کے اندر (جس شکل میں وہ آج ہمارے سامنے موجود ہیں) ایسی ایسی باتیں لکھی

ہیں جنہیں اور تو اور خود ہندو صاحبان بھی اس قابل نہیں سمجھتے کہ انہیں ویدوں میں رکھا جائے۔ اس سے آپ اندازہ فرما سکتے ہیں کہ انہیں غیر محرف آسمانی کتابیں کس طرح تسلیم کیا جا سکتا ہے؟ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے (اور جیسا کہ خود ہندو صاحبان کو بھی تسلیم ہے۔) وید قدیم آریہ قوم کی ابتدائی قبائلی زندگی کی معاشرت کی تاریخ ہیں۔ اس لئے ان میں تعلیم بھی اسی قسم کی ہے، جیسی ابتدائی قبائل یا اقوام کی زندگی ہوتی ہے۔ چنانچہ ویدوں میں کہیں اس امر پر استعجاب ہے کہ "سُرخ رنگ کی گائے کس طرح سفید رنگ کا دودھ دیتی ہے"۔ کبھی اس پر کہ "تمام دریا سمندر میں جا گرتے ہیں لیکن سمندر پھر بھی نہیں بھرتا"۔ اس زمانہ میں قربانیاں، مذہب کی اصل و بنیاد ہوتی تھیں اس لئے ویدوں میں اکثر و بیشتر قربانی (اس کے لزوم و ماجریات سے متعلق گیت، منتر اور احکام ملتے ہیں۔ قربانی کے وقت ہوتر برہمن رگوید کے منتر پڑھتا تھا۔ ادھوریو ADHVARYU یجروید کے منتر پڑھتا اور اوگاتا برہمن سام وید کے۔ بعد میں ان پروہتوں میں ایک اور کا اضافہ ہوا جسے برہما کہا جاتا ہے، وہ گویا ان کا صدر تھا۔ وہ اس امر کی نگرانی کرتا تھا کہ قربانی اتھروید کے اصول و احکام کے مطابق ادا ہوتی ہے یا نہیں۔ قربانیوں میں سوم رس کا استعمال عام ہوتا اور اسے مقدس سمجھا جاتا۔ (ان امور کی تصریحات کے لئے دیکھئے (اس گیتا کی محولہ صدر کتاب)

قدیم آریوں کا معاشرتی نقشہ

ابتدائی خانہ بدوشی کی زندگی کے بعد، ان آریوں نے زراعت کی زندگی اختیار کی۔ چنانچہ اس زمانہ میں ویدوں کے جو منتر تصنیف ہوئے۔ ان میں ان کی اسی زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً یجروید، ادھیاء ۱۲، منتر ۸۲ میں لکھا ہے:-

> "اے انسان! جس طرح طاقت ور گائے نباتات کو کھا کر بچھڑے اور انسانوں کے لئے عمدہ دودھ دیتی ہے، اسی طرح تو بھی پھل پھولوں کے رس کا استعمال کر کے اپنے جسم اور آتما کی طاقت کو حاصل کر۔"

اسی ادھیا کا اکہتر واں (۷۱) منتر یہ ہے:-

> "اے کسانو! تم اناج وغیرہ بونے کے لئے زمین کو پھاڑنے والا جو "پھال" ہے اور اسی پھال کو مضبوط کرنے کے لئے اس کے پیچھے جو لکڑی کی خوبصورت پٹی لگی ہوتی ہے، تم اس سے اناج پیدا کرنے والی زمین کو پھاڑو۔ اسی طرح تم اپنے خوبصورت رتھوں کو چلاؤ اور اپنی حفاظت کرو۔"

اس سے پہلے چار منتروں میں لکھا ہے:۔

"روشن عقل اور روشن ضمیر انسان ہل کو جوئے میں لگا کر کھیتی کا کام کرتے اور تمام وِدوانوں کے سکھ کو بڑھاتے ہیں۔ اے انسانو! تم ہلوں کو جوئے میں لگا کر کھیتی کی خاطر زمین کو اچھی طرح جوتو اور اس کو اچھی طرح سے جوت کر اس میں جو وغیرہ اناج بوؤ...... جو محنت کرنے والا کاشت کار ہے اس کو چاہیئے کہ بیلوں کے ذریعے ہل پھال لگا کر زمین کو جوتے........ وِدوانوں کو چاہیئے کہ وہ ہل کی نوک دار پٹی کو پانی اور گھی اور شہد یا شکر وغیرہ، پدارتھوں میں اچھی طرح بھگو کر مضبوط کریں تاکہ وہ زمین کو اچھی طرح کھود سکے۔ اس سے ہم گھی وغیرہ حاصل کریں گے۔ اس پٹی کو بار بار پانی میں تر کرنا چاہیئے۔"

ادھیائے ۱۸ منتر ۱۲ اس سے بھی واضح ہے:۔

"میرے چاول اور ساٹھی کے دھان۔ میرے جَو اور ارہر۔ میرے اُڑد اور مٹر، میرے تل اور ناریل میرے مونگ اور اس کا بنانا، میرے چنے اور اس کا سدھ کرنا، میری کنگنی اور اس کا بنانا، میرے سو کشم چاول اور ان کا پکانا، میرا سانوک اور منڈوا نا، چینا وغیرہ چھوٹے چھوٹے اناج۔ میرے بغیر بوئے ہوئے چاول اور ان کا پکانا، میری مسور اور ان کے سمندھی اناج۔ یہ سب کے سب تمام اناجوں کے دینے والے ایشور سے سامرتھ ہوں۔"

تشبیہات بھی اسی قسم کی ہیں۔ مثلاً یجر وید۔ ادھیائے ۲۸ منتر ۳۲ میں ہے:۔

"اے انسانو! جیسے بیل گوؤں کو گابھن کر کے پشوؤں کو بڑھاتا ہے۔ اسی طرح گرہستی لوگ عورتوں کو حاملہ کر کے پرجا کو بڑھا دیں۔"

خدا کا تصوّر

مذہب کی بنیاد خدا کے صحیح تصوّر اور اس کی توحید پر ہے۔ ظاہر ہے کہ جو مذہب انسانی دماغ کی تخلیق ہو، یا جن الہامی مذاہب میں انسانی دست بُرد نے تصرفات کر دیئے ہوں، ان میں خدا کا تصوّر ذہنِ انسانی کا تراشیدہ ہوتا ہے اور چونکہ ذہنِ انسانی محسوسات سے آگے نہیں بڑھ سکتا، اس لئے اس کا تخلیق کردہ "خدا" بھی اسی قالب میں ڈھلا ہوا ہوتا ہے۔ ویدوں میں خدا کا تصوّر کس قسم کا ملتا ہے، اس کا اندازہ اتھروید کانڈ ۱۱ سوکت ۲ منتر ۵-۶ کے صرف ایک اقتباس سے لگ سکتا ہے۔ اس میں

لکھا ہے کہ:۔

"ہے پشوپتے! جیوؤں کے سوامی! پرماتمن! تیرے مکھ (منہ) کو نمسکار ہے۔ ہے پربھو! سراتپادک ایشور! تیری جو چکشوئیں (آنکھیں) ہیں۔ ان کو نمسکار ہے۔ تیری توو چا (چمڑی جسم) کو نمسکار ہے۔ تیرے سمیگ درشن روپ پریتک آتم سوروپ کانتی، تیج کے لئے نمسکار ہے۔ ہے پرمیشور! تیرے انگوں (اعضاء) کو نمسکار ہے۔ تیرے اوربھاگ (پیٹ) کو نمسکار ہے۔ تیری جیبھ (زبان) کو نمسکار ہے۔ تیرے آسیہ مکھ (چہرے) کو نمسکار ہے۔ تیرے دانتوں کو نمسکار ہے۔ تیرے (دانتوں کی) گندھ (بو) کو نمسکار ہے۔"

دوسرے خدا

ہندوؤں میں برہما، شِو اور وشنو تین خدا مانے جاتے ہیں۔ آجکل اس کا یہ مفہوم بتایا جاتا ہے کہ یہ تینوں مستقل خدا نہیں ہیں بلکہ پرماتما کی تین صفتوں کے مظہر ہیں۔ برہما (پیدا کرنے والا) شوجی (سلسلہ کو آگے بڑھانے والا) اور وِشنو (ہلاک کرنے والا) ان میں سے شوجی کی پرستش (لنگ کے توسط سے) عام ہوتی ہے لیکن مسٹر گووند داس کی تحقیق یہ ہے کہ برہما، شو، وِشنو کا نام ویدوں میں تو ایک طرف، رامائن و مہابھارت تک میں بھی کہیں نہیں ملتا۔ ویدوں میں ان کی جگہ ورن، اندر اور اگن کا نام آتا ہے جو اب بالکل بھلائے جا چکے ہیں۔ موجودہ دَور میں برہما کی پرستش بالکل غائب ہے۔ پرانوں میں ہے کہ برہما کی پرستش اس لئے بند کر دی گئی ہے کہ:۔

معاذاللہ

"ایک دفعہ شوجی نے دیکھا کہ وہ اپنی لڑکی سرسوتی سے امرِ شنیع کا مرتکب ہو جانا چاہتا ہے۔" (ہندوازم، صفحہ ۱۸۴) لیکن ہندوؤں کی مقدس کتابوں مثل شتھ پت برہمن، تانڈیہ مہابراہمن، مہابھارت اور رامائن وغیرہ میں برہما کے اس فعل کی مذمت نہیں کی گئی۔ مہابھارت اور یوگ پرب ادھیائے ۱۱۷ میں مندرجہ صدر واقعہ کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔" (ویدارتھ پرکاش صفحہ ۱۰۱ از پنڈت آتمانند)

یہ تو تھا خدا کے تصور کے متعلق۔ اب رہی خدا کی توحید تو ہندومت میں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ توحید کا مفہوم یہ ہے کہ خدا اپنی ذات اور صفات میں وحدہٗ لاشریک ہے۔ اس کی مثل و نظیر کوئی نہیں۔ اس کی ذاتِ صمدیت کسی کی محتاج نہیں لیکن ہندومت کی تمام اساس ہی دیوتاؤں کی پرستش پر ہے۔ مسٹر گووند داس کی تحقیق کے مطابق "ویدوں میں ۳۳ دیوتا تھے لیکن بعد میں ان کی تعداد ۳۳ کروڑ تک پہنچ گئی۔" (ہندوازم ص ۱۵۹)

دیوتا یہی نہیں ہر کام اور ہر ضرورت کے لئے الگ الگ دیوتا ہو۔ بلکہ ہر چیز کا جداگانہ دیوتا۔ چنانچہ یجروید کی چوبیسویں ادھیائے میں ہے:۔

"تیز رفتار گھوڑے، مارخور بکرے، نیل گائے کا دیوتا سورج ہے۔ کالی گردن والے پشو کا دیوتا اگنی ہے۔ داغدار پیشانی والی بھیڑ کا دیوتا، سرسوتی ہے۔ کالے رنگ والے تند خو، بائیں اور دائیں طرف سفید دھاریوں والے یا بالکل سیاہ دھاریوں والے پشوؤں کا دیوتا یم ہے۔ جس کے دم پر سفید داغ ہوں، اس پشو کا دیوتا دایو ہے۔ بغیر بہار آئے سانڈ سے جفتی کر کے حمل اسقاط کرنے والی گائے کا اور چھوٹے قد اور ٹیڑھے ترچھے اعضاء والے پشو کا دیوتا وشنو ہے۔ سرخ اور سرخی مائل سیاہ رنگ والے اور بیر کے مانند ارغوانی رنگ والے پشوؤں کا دیوتا سوم ہے..... اگلی ٹانگوں پر سفید داغوں والے، اگلے زانوؤں پر سفید داغوں والے پشوؤں کا دیوتا برہسپتی ہے۔ آسمانی رنگ والے پشوؤں کا دیوتا میگھ ہے۔ کالی گردن والے، سفید جوڑوں والے، موٹی ٹانگوں والے پشوؤں کا دیوتا پون اور بجلی ہے۔ نیچی آواز والی، اونچی آواز والی اور مدھم آواز والی، تین قسم کی بھیڑوں کا دیوتا پرتھوی ہے۔ لال رنگ والوں کا دیوتا رُدر ہے۔ مگرمچھ کے بچے اور مگرمچھ اور دیگر آبی جانوروں کا دیوتا سمندر ہے۔"

اتھروید کانڈ ۵ سوکت ۲۴ میں ہے:۔

"سوتا دیوتا حاملہ عورتوں کا دیوتا ہے۔ وہ میری رکشا کرے (۱) اگنی دیوتا جو نباتات کا مالک ہے، مجھے محفوظ رکھے۔ (۲) دیئو اور زمین جو سخیوں کی مالکہ ہیں وے دونوں دیوی میری رکشا کریں۔ (۳) ورن دیوتا جو پانیوں کا مالک ہے میری حفاظت کرے۔ (۴) متر اور ورن نامی دیوتے جو بارش کے مالک ہیں میری رکشا کریں۔ (۵) کرت دیوتے جو پہاڑوں کے مالک ہیں میری حفاظت کریں۔ (۶) سوم دیوتا جو بیلوں کا مالک ہے میری حفاظت کرے۔ (۷) ہوا جو طبقۂ وسطیٰ کی مالک ہے مجھے محفوظ کرے۔ (۸) سورج دیوتا جو آنکھوں کا مالک ہے میری رکھشا کرے۔ (۹) چاند جو تاروں کا مالک ہے میری حفاظت کرے۔ (۱۰) اندر دیوتا جو دیولوک کا مالک ہے میری رکشا کرے۔ (۱۱) ہرتوں کا باپ جو حیوانوں کا مالک ہے۔ میری رکشا کرے (۱۲) موت کا دیوتا جو رعایا یا جانداروں کا مالک ہے میری حفاظت کرے (۱۳) یم راج جو مرے ہوئے پتروں کا مالک ہے مجھے

محفوظ رکھے۔"

اسی طرح رگوید منڈل نمبر ۶ سوکت نمبر ۵۲ منتر نمبر ۱۳-۱۴ میں ہے:-

"چڑھتی ہوئی اشا (شفق) میری رکشا کرے۔ لہروں والے دریا میری حفاظت کریں۔ ساکن پہاڑ میری رکشا کریں اور سورگ میں پہنچے ہوئے میرے پتر میری حفاظت کریں۔ (۱) تمام دیوتا میری اس پکار کو سنیں، جو طبقۂ وسطیٰ اور طبقہ علوی میں ہیں اور جو آگ کی زبان والے اور ہوا والے ہیں، وہ میری اس کشا پر آکر بیٹھیں۔"

اسی طرح مختلف ویدوں میں سانپوں کی پرستش، بانجھ گائے کے بالوں اور کھروں کو سجدہ، گھوڑوں اور گھوڑے کے مالکوں کو سجدہ، نائی کے اُسترے اور سردی والے بخار کو نمسکار (سجدہ) کرنے کی تلقین موجود ہے۔ اتھروید کانڈ نمبر ۳ سوکت نمبر ۱۰ منتر نمبر ۲-۳ میں سموتسر دیوتا کے بت کی پرستش کا ذکر موجود ہے۔ ان تصریحات کے پیشِ نظر یہ حقیقت نکھر کی سامنے آجاتی ہے کہ خدا پرستی کے بارے میں ویدوں کی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں کہلا سکتی۔ ہم اس بات کو ایک مرتبہ پھر دہرا دینا چاہتے ہیں کہ ہمیں تسلیم ہے کہ کسی زمانہ میں ہندوستان میں بھی خدا کی طرف سے آسمانی ہدایت کی مقدّس قندیل نازل ہوئی ہوگی لیکن وہ روشنی حوادثِ ارضی و سماوی یا انسانی تحریفات سے محفوظ نہ رہ سکی اور جس چیز کو آج آسمانی روشنی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے، وہ اس دعوے کی تکذیب کی خود زندہ شہادت ہے۔

ہمارا جذبۂ احترام

ہندوستان کی جن مقدّس ہستیوں کو آسمانی ہدایت کی شمعِ نورانی ملی ہوگی ان کی تعظیم واحترام ہمارا جزوِ ایمان ہے لیکن وہ تعلیم جو ویدوں میں آج موجود ہے، اسے ایسی ہستیوں کی طرف کبھی منسوب نہیں کیا جا سکتا۔ مسٹر گوونداس اس باب میں رقمطراز ہیں:-

"ان تمام لوگوں کو جو آج یہ دعوے کرتے ہیں کہ ہمارا موجودہ مذہب وہی ہے جو ویدوں کے زمانہ میں تھا اور جو ناقابلِ تغیّر و تبدّل ہے، ان حقائق پر غائر نگاہ سے غور کرنا چاہیئے۔ وہ لوگ جو تاریخ کا اس طرح بطلان کرتے ہیں اور ان مسلسل تغیرات سے چشم پوشی کرتے ہیں، سخت غلطی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو بھی اور ہندوستان کو بھی سخت نقصان پہنچاتے ہیں۔"

(ہندوازم، صفحہ ۱۸۶)

معاملات کی دنیا

خدا پرستی سے نیچے اتر کر معاملات کی دنیا میں آیا جائے تو وہاں بھی ویدوں میں عجیب وغریب قسم کی تعلیم ملتی ہے۔ اس باب میں پھر وہی مشکل ہمارے

گلوگیر ہوجاتی ہے، جس کی طرف شروع میں اضافہ کیا گیا ہے۔ اس لئے ہم دو ایک مثالوں سے آگے نہیں بڑھ سکتے اتھروید کانڈ ۵ سوکت ۱۷ منتر ۸-۱۱ نیز رگوید منڈل ۱۰ سوکت ۱۰۹ منتر ۷-۹ میں لکھا ہے:۔

اگر کسی ایک عورت کے پہلے دس غیر براہمن خاوند موجود ہوں، اگر برہمن اس کا ہاتھ پکڑ لے، تو وہی اکیلا اس کا خاوند سمجھا جائے کیونکہ برہمن ہی عورتوں کا مالک یا خاوند ہے، نہ کہ کشتری اور ویش۔

اس ایک حکم سے آپ پوری کی پوری معاشرتی اور عائلی زندگی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وہی عائلی زندگی جس کے متعلق اتھروید کانڈ ۱۴ سوکت ۲ منتر ۱۸ و ۱۷ میں یہ چیز بھی موجود ہے۔

"خاوند سے سنتستان کے ابھاؤ (اولاد نہ ہونے) میں دیور کی کامنا (چاہت) کرنے والی عورت"۔

اسی بناء پر مہامنی یاسک اچاریہ نے نرکت میں دیور کے معنی ہی دوسرا ور (خاوند) لکھا ہے۔ (ویدارتھ پرکاش صفحہ ۱۲۳) انہی چیزوں کے پیش نظر مسٹر گووندا اس یہ لکھنے پر مجبور ہو گئے کہ،

"ویدوں کی ازلیت و تقدیس کا عقیدہ کسی ایسے شخص کے نزدیک قابل قبول نہیں ہو سکتا جس کی نگاہ تاریخ پر ہو۔ یہ عقائد بالکل باطل ہیں۔ ہر اس شخص کے نزدیک، جس نے ویدوں کا خالی الذہن ہو کر مطالعہ کیا ہو.......... ان کے بے شمار باہمی تضادات، ان کے اکثر و بیشتر مہملات، ان کے مضحکہ انگیز بیانات اور فحش نگاری، قدیم ایام میں بھی ان لوگوں کی طرف سے جنہوں نے رائے عامہ کی پرواہ نہ کی، سخت تنقید کا مرکز بنی رہی ہے۔ چنانچہ چارواک کے نزدیک ویدوں کے مصنف.....ط..... تھے۔ (ہندوازم، صفحہ ۸۸-۸۷)

ویدوں کے علاوہ

ہم نے شروع میں لکھا ہے کہ ویدوں کے علاوہ برہمن، آرینک اور اُپ نشد بھی عہدِ قدیم کا مقدس لٹریچر تصور کیا جاتا ہے۔ اگر ہندو دھرم میں یہ متعین ہوتا کہ صرف ویدی مذہب کی مستند کتاب ہیں تو ہمیں ان سے آگے بڑھنے کی ضرورت نہ تھی لیکن (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے)

ط یہاں جو الفاظ مسٹر گووندا اس نے استعمال کئے ہیں۔ انہیں وہ تو لکھ سکتے تھے کہ وہ خود ہندو ہیں لیکن ہم انہیں نقل کرنے کی بھی جرأت نہیں کر سکتے۔

ہندومت میں اس امر کا تعین ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے ان کے ہاں جو جو کتابیں مقدس سمجھی جاتی ہیں، ان کا تذکرہ ہمارے لئے ضروری ہو گیا۔ برہمن ویدوں کی تفاسیر ہیں۔ لیکن عقیدہ یہ ہے کہ یہ تفاسیر بھی الہامی ہیں۔ آرینک اُن رشیوں کے حالات کا مجموعہ ہے جو بستیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں چلے گئے اور چونکہ وہاں قربانیاں کر نہیں سکتے تھے، اس لئے عالم تصوّر میں ان مذہبی رسومات و فرائض کو ادا کرنے لگ گئے لیکن ہندو مذہب میں رشیوں کی حیثیت و منصب کے متعلق بھی کچھ متعیّن نہیں، یعنی جس طرح رسول یا نبی کی حیثیت، مقام، اور منصب متعین ہے اور ان کے بعد محدّثین و مفسّرین، فقہاء وغیرہ کے مناصب و مقامات کے متعلق بھی معلوم ہے کہ وہ کیا ہیں اور کیا نہیں ہیں۔ اسی طرح رشیوں کے متعلق کچھ معلوم و متعیّن نہیں[1]۔

اُپ نشد

اُپ نشد اپنی مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ 'BUNSSEN' کے نزدیک اس لٹریچر کی تقسیم یوں سمجھئے کہ برہمن ان لوگوں کے لئے ہیں جو عائلی زندگی بسر کریں۔ آرینک ان کے لئے جو بن باس اختیار کریں اور اُپ نشد ان کے لئے جو ان سے آگے سنیاس کی زندگی شروع کریں، جس میں انسان مراقبہ و تصورات میں ایشور گیان (معرفتِ خداوندی) حاصل کرتا ہے۔ (داس گپتا ص ۲۹)

اُپ نشد تعداد میں ۱۱۲ ہیں۔ اگرچہ وہ مجموعہ، جس کا ترجمہ دارا شکوہ نے کرایا تھا، صرف ۵۰ پر مشتمل تھا۔ اُپ نشد تمام کی تمام عہدِ قدیم کی تصانیف ہیں بلکہ ان میں ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا رہا ہے۔ حتّٰی کہ ان میں بعض چودھویں اور پندرھویں صدی عیسوی کی تصانیف بھی ہیں (داس گپتا۔ ص ۲۸) ویدانت کا فلسفہ جس کے سب سے بڑے پرچارک شنکر اچاریہ ہیں، انہی اپ نشدوں پر مشتمل ہیں، ویدانت کی رُو سے کمال زندگی۔

ایک ایسی نیند کی سی حالت ہے۔ جس میں خواب تک نہ آئے[2]۔ جسے یہ ابدی سرور حاصل

---

[1] ہندوؤں کی اصطلاح میں سرتی وہ الہامی تعلیم ہے جو سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آئی اور سمرتی مذہب کے بزرگوں کی تصانیف ہیں۔ برہمن آرینک اور اُپ نشد کے متعلق یہ طے نہیں کہ یہ سرتی ہیں یا سمرتی۔

[2] ویدانت یا وحدت الوجود کے تصوّف کا منتہائے نظریہ ہے کہ انسان مکان اور زمان (SPACE AND TIME) کی جکڑبندیوں سے آزاد ہو جائے تاکہ اس کی ہستی کا واہمہ سمٹ کر یہ برہما (یا ذات واجب الوجود) میں پھر سے جا ملے لیکن یہ جکڑبندیاں بالخصوص (زمان TIME کی گرفت) ایسی سخت ہیں کہ ان سے باہر نکلنا ممکن نہیں لیکن ایک ویدانتی اپنے عالمِ استغراق و محویت میں یہ خیال کر لیتا ہے کہ وہ زمان کی قیود سے آزاد ہو گیا ہے۔ وہ لمحہ جس

(بقیہ اگلے صفحہ پر)

ہوجائے، اسے کسی قسم کا خوف نہیں رہتا.........اس کی بنیاد اس عقیدہ پر ہے کہ کائنات میں جو کچھ ہے۔ سب. برہما سے نکلا ہے اور برہما ہی میں واپس جا ملے گا۔"

(داس گپتا۔ صفحہ ۴۷ - ۴۸)

اور نجات یہ ہے کہ "انسان اپنے آپ کو پہچان لے۔ معرفتِ نفس فی ذاتہٖ مکتی ہے۔ اس سے انسان برہما کے ساتھ ایک ہوجاتا ہے۔ نجات کا مدار اعمال پر نہیں بلکہ معرفت ہے۔" (داس گپتا صفحہ ۵۵۔۶۰)

برہمن کے متعلق مسٹر گووند داس کی تحقیق یہ ہے کہ :-

"ان کی تصنیف میں بھی صدیاں لگی ہیں اور اس عرصہ میں ان میں بھی بہت کچھ حک و اضافہ ہوتا رہا ہے۔"

(ہندوازم۔ صفحہ ۱۰۶)

آرینک کے متعلق یہ صاحب لکھتے ہیں :-

"ان میں بعض عجیب و غریب قسم کی قربانیوں کے احکام ہیں۔ مثلاً برہما، میدہ اور مہا ورت۔ ایک نہائیت ناپاک تقریب، جس میں فحش کاری کا مظاہرہ ہوتا ہے اور انسانی نطفہ بطور چڑھاوا پیش کیا جاتا ہے۔" (ایضاً ص ۱۰۷)

اور اُپ نشدوں کے متعلق :-

"اپ نشدوں کے مستند ہونے کے متعلق بہت سا خلجان ہے۔ ان کی تعداد[ط] تین سو سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں سے کون کون سے اصل اور کون سے جعلی ہیں؟ یہ سوال سرِدست ہم سے متعلق

ط حالانکہ ڈاکٹر داس گپتا نے صرف ۱۱۲ لکھا ہے۔

(بقیہ فٹ نوٹ ص ۹۷)

میں یہ (بزعمِ خویش) اپنے آپ کو ان تعینات کی حدود سے ماوراء سمجھ لیتا ہے، اس کے نزدیک وصال (یعنی اپنی اصل سے مل جانے) کا لمحہ ہے۔ لہٰذا اگر یہ استغراق مستقل ہوجائے تو وصال بھی مستقل (یعنی فنائے کامل) ہوجاتا ہے۔ اسی کا نام ہے ایک ایسی نیند جس میں خواب تک نہ ہو۔ غور فرمایئے کہ یہ فلسفہ کس طرح تصوّر ہی تصوّر میں انسان کے ذہن میں ایک نئی دنیا بسا دیتا ہے، جس کی حقیقت واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں ہوتی۔ یہ سب کشمکش زندگی سے فرار کی نظر فریب راہیں ہیں۔

نہیں۔ یہ یا تو تمام کے تمام اصل ہیں، یا تمام کے تمام جعلی اور اس کا فیصلہ اس امر پر ہے کہ آپ انہیں کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ (یعنی فیصلہ عقیدت پر ہے)۔" (اصفحہ ۱۰۶)

اُپ نشدوں کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ :-

"ان میں بہت سے ابہامات ہیں اور (اس لئے) ان کی بہت سی تفاسیر کی گئی ہیں۔"

(THE DISCOVERY OF INDIA. P.66)

شاستر

اس کے بعد ہندوؤں کے عام فلسفہ سے متعلق کتابوں کو لیجئے، جنہیں شاستر کہا جاتا ہے۔ اس فلسفہ کی دو شاخیں ہیں۔ ایک ناستک اور دوسرا آستک۔ ناستک فلسفہ کے مؤید نہ ویدوں کو غلطی سے مبرا مانتے ہیں اور نہ انہیں بطور سند تسلیم کرتے ہیں۔ ناستک میں بدھ مت، جین مت اور چارواک فرقے شامل ہیں (اور سب ہندو قرار دیئے جاتے ہیں) آستک کے چھ مذاہب SCHOOLS OF THOUGHT ہیں۔ یعنی سانکھ، یوگ، ویدانت، میمانسا، نیایا، ویسے شک۔ یہ ویدوں کو تنقید سے بالا مانتے ہیں۔ سانکھ کپل کی طرف منسوب ہے، جس کی ہستی محض افسانوی ہے۔ یہ خدا کی ہستی کا منکر ہے اور محض عقل کی رُو سے نجات کا حامی۔ اس اسکول کا عہدِ قدیم کا تمام لٹریچر ضائع ہو چکا ہے۔ (داس گپتا ص۶۸) دوسرا شاستر یوگ ہے۔ جس کا بانی پتنجلی کہا جاتا ہے۔ اس کی رُو سے ایشور (خدا) کو آتما (روح) سے الگ مانا جاتا ہے۔ اس میں حبسِ دم (پرانا یم) کو حسنِ عمل قرار دیا گیا۔ جس کی وجہ سے ایسی قوتیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ انسان ہوا پر اُڑ سکتا ہے، دریا پر چل سکتا ہے، لوگوں کے دل کی بات معلوم کر سکتا ہے۔ تیسرا شاستر ویدانت ہے (جسے اتر میمانسا بھی کہتے ہیں) اسے بیاس دیوجی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اس کا فلسفہ اُپ نشدوں کی تعلیم کا ماحصل ہے۔ جس پر سارے ہندو تصوف کی بنیاد ہے۔ اس کی رُو سے کائنات کی ہر شئے برہما ہے (یعنی جو نسبت مٹی کو برتن سے اور موج کو دریا سے ہے، وہی نسبت موجودات کو خدا سے ہے) انسان کا کمال یہ ہے کہ مادہ کو ترک کر کے برہما میں جذب ہو جائے۔ چوتھا شاستر میمانسا (یا پورب میمانسا ہے) جو جیمی جی کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ اس میں قربانی سے متعلق احکام ہیں اور انسان کو مختار بالارادہ قرار دیا گیا ہے۔ اس حد تک کہ یہ خدا کا بھی قائل نہیں۔ (منوسمرتی کے قوانین جو آجکل HINDU LAW کی حیثیت لئے ہوئے ہیں، اسی شاستر کے مطابق ہیں)۔ (داس گپتا، صفحہ ۳۷۱ و ۴۰۲) پانچواں شاستر نیایا ہے، جو گوتم یا نیاشاستر کا مرتب کردہ ہے۔ اس میں انسان کو مجبورِ محض بتایا گیا ہے اور منطق کو ایک خاص حیثیت دی گئی ہے۔ چھٹا شاستر ویسے شک ہے۔ جس کا مصنف کناد ہے۔ اس میں طبیعیاتی اور ماوراء الطبیعیاتی مسائل سے بحث کی

گئی ہے۔

فلسفہ کی ان تمام شاخوں میں قدرِ مشترک متشائم نظریۂ حیات 'PESSIMISM' ہے۔ خوشی دراصل خوشی نہیں، وہ بھی غم ہی کا پیش خیمہ ہے۔ اصل خوشی خواہشات کے ترک میں ہے۔" (واس گیتا، صفحہ ۷۹)

وہی ترکِ دُنیا اور ترکِ لذّات کی تعلیم۔

پران | پران بھی ہندوؤں کی مقدس کتابیں ہیں۔ پرمانند پران کی رُو سے شروع میں وید کی طرح پران بھی ایک ہی تھا جسے ویاس جی نے ویدوں کی ترتیب کے بعد تصنیف کیا تھا۔ ویاس جی کے شاگردوں نے اس ایک سے چار پران مرتب کر لئے۔ اس کے بعد ان کی تعداد اٹھارہ تک بڑھ گئی۔ اٹھارہ سے چھتیس[۳۶]، چھتیس سے چوّن اور اس کے بعد ساٹھ تک جا پہنچی۔ شروع میں ان کے کل اشلوکوں کی تعداد قریب چار ہزار تھی۔ اب دس لاکھ سے بھی زیادہ ہیں۔ پران "اپنی موجودہ شکل میں سب ایک دوسرے سے متضاد ہیں"۔ (ہندوازم صفحہ ۱۱۷) حتیٰ کہ "کسی پران کے دو نسخے بھی آپس میں نہیں ملتے"۔ (ایضاً صفحہ ۱۱۹) پُران عجیب وغریب افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ان میں دس دس ہزار اور ساٹھ ساٹھ ہزار سال کی عمر کے انسان عام طور پر ملتے ہیں"۔ (ایضاً صفحہ ۱۳۳) ان کی تعلیم کا اندازہ لگانے کے لئے ایک دو مثالیں کافی ہوں گی کیونکہ ان سے آگے بڑھنے میں وہی دشواری مانع ہے، جس کا شروع میں ذکر کیا گیا ہے۔ پدم پُران میں ہے کہ برہما (یعنی ہندوؤں کے عقیدہ کی رُو سے خالقِ کائنات) اہنکاری (معاذ اللہ شہوت پرست) ہے۔ اس نے اپنی بیٹی سرسوتی کی طرف بری نگاہ سے دیکھا، تب اس کی بددعا سے اس کے منہ سے فحش جاری ہوا۔ شو پوران میں ہے کہ:۔

"شوجی نے خواہش کی کہ میں دنیا کو پیدا کروں۔ اس نے برہما کو پیدا کیا۔ برہما نے ایک چلّو پانی اٹھا کر پانی میں پھینک دیا۔ اس سے ایک بلبلا اٹھا۔ بلبلے میں سے ایک آدمی پیدا ہوا۔ اس نے برہما سے کہا۔ "اے بیٹے! دنیا کو بنا"۔ برہما نے کہا۔ میں تیرا بیٹا نہیں بلکہ تو میرا بیٹا ہے"۔ دونوں میں جھگڑا برپا ہوا۔ مہادیو (شوجی) نے سوچا کہ جن کو میں نے دنیا بنانے کے لئے بھیجا تھا۔ وہ دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہیں۔ تب ان دونوں کے بیچ میں سے ایک نورانی لنگ پیدا ہوا اور فوراً وہ آسمان میں چلا گیا۔ اس کو دیکھ کر دونوں حیران رہ گئے۔

دونوں سوچنے لگے کہ اس لنگ کا شروع اور آخر معلوم کرنا چاہیئے۔ جو پہلے آئے وہ باپ، جو پیچھے آئے، وہ بیٹا کہلائے۔ وشنو کچھوے کی شکل بنا کر لنگ کا پتہ لگانے کے لئے نیچے کو چلا؛

اور برہما ہنس کا جسم بنا کر اوپر کو اڑا۔ دو ہزار برس دونوں من کی سی تیز رفتار سے چلتے رہے مگر لنگ کی حد نہ ملی۔ برہما نے سوچا۔ اگر وشنو پتہ لے آیا ہوگا، تو مجھ کو اس کا بیٹا بننا پڑے گا۔ وہ ایسا سوچ ہی رہا تھا کہ اسی وقت ایک گائے اور کیتکی کا درخت اوپر سے اترا۔ برہما نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم ہزاروں برس سے اس لنگ کے سہارے چلے آئے ہیں۔ برہما نے پوچھا کہ اس لنگ کی کوئی حد ہے یا نہیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں۔

برہما نے کہا کہ میرے ساتھ چل کر ایسی گواہی دو کہ گائے اس لنگ کے سر پر دودھ کی دھار بہاتی تھی اور درخت کہے کہ میں پھول برساتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہم جھوٹی گواہی نہیں دیں گے۔ تب برہما خفا ہو کر بولا کہ اگر گواہی نہیں دو گے تو میں تم کو ابھی خاکستر کر دوں گا۔ تب دونوں نے ڈر کر کہا کہ جیسے تم کہتے ہو، ویسی ہی گواہی دیں گے۔ تب تینوں نیچے کی طرف چلے۔

برہما نے وشنو سے سوال کیا کہ تو نے اس لنگ کی حد معلوم کی یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں برہما نے کہا کہ میں پتہ لے آیا ہوں۔ وشنو نے کہا کہ کوئی گواہی دو۔ تب گائے اور درخت نے جھوٹی گواہی دی۔ اس پر لنگ نے کیتکی کو بددعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے۔ تیرا پھول مجھ پر یا کسی دیوتا پر کبھی نہیں چڑھے گا۔ جو کوئی چڑھاوے گا اس کا ستیاناس ہوگا۔ گائے کو بددعا دی کہ جس منہ سے تو نے جھوٹ بولا ہے تو اس مُنہ سے پاخانہ کھایا کرے گی۔ تیرے منہ کی پرستش کوئی نہیں کرے گا لیکن دُم کی کریں گے۔ برہما کو بددعا دی کہ تو نے جھوٹ بولا ہے، اس لئے تیری پرستش دنیا میں کبھی نہیں ہوگی۔ وشنو کو دعا دی کہ تو نے سچ بولا ہے۔ اس لئے تیری پرستش سب جگہ ہوگی۔ پھر دونوں نے لنگ کی حمد وثنا کی۔

اس حمد وثنا کو سن کر لنگ میں سے ایک جٹا جوٹ صورت نکل آئی اور کہنے لگی کہ میں نے تم کو خلقت پیدا کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ تم جھگڑے میں کیوں پڑ گئے۔ تب مہادیو نے بالوں میں سے ایک راکھ کا گولا نکال کر دیا اور کہا کہ جا کر اس سے خلقت پیدا کرو۔"

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش سوامی دیانند جی صفحہ ۲۷۲-۳۷۳)

دیوی بھاگوت میں ایک عورت کی کتھا لکھی ہے:۔

"اسی نے سب دنیا کو بنایا اور برہما وشنو سادیو کو بھی اس نے پیدا کیا۔ جب اس دیوی کو خواہش ہوئی تو اس نے اپنا ہاتھ گھسا۔ اس سے ہاتھ میں ایک آبلہ پیدا ہوا۔ اس میں سے برہما کی پیدائش ہوئی۔ اس سے دیوی نے کہا۔ تو مجھ سے شادی کر۔ برہمانے کہا۔ "تو میری ماں ہے، میں تجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔ یہ سن کر ماں کو غصہ آیا اور لڑکے کو جلا کر خاک کر دیا۔ دیوی نے اسی طرح پھر ہاتھ گھس کر دوسرا لڑکا پیدا کیا۔ اس کا نام وشنو رکھا۔ اس کو بھی اپنے ساتھ شادی کرنے کے لئے کہا مگر اس نے بھی نہ مانا۔ چنانچہ اس کو بھی راکھ کر دیا۔ پھر اس نے تیسرے لڑکے کو پیدا کیا۔ اس کا نام مہادیو رکھا۔ اس سے بھی کہا کہ تو مجھ سے شادی کر۔ مہادیو بولا۔ "میں تجھ سے شادی نہیں کر سکتا۔ تو دوسرا جنم بنالے تو شادی کروں گا۔" چنانچہ دیوی نے ایسا ہی کیا۔

مہادیو بولا کہ یہ دو جگہ راکھ کیسی پڑی ہے۔ دیوی نے کہا کہ یہ دونوں تیرے بھائی ہیں۔ انہوں نے میرا حکم نہیں مانا تھا۔ اس لئے راکھ کر دیئے ہیں۔ مہادیو نے کہا کہ میں اکیلا کیا کروں گا ان کو زندہ کر دے گا اور دو عورتیں پیدا کر۔ پھر تینوں کی شادی تینوں سے ہوگی۔"

(بحوالہ ستیارتھ پرکاش سوامی دیانندجی صفحہ ۳۴۰)

پرانوں کی تعلیم کی مزید تفصیلات کے لئے ستیارتھ پرکاش دیکھنی چاہیئے۔ جس میں سوامی دیانند نے ان کتابوں کی مضحکہ خیز انداز سے تردید کی ہے اور انہیں سخت ناقابلِ اعتبار قرار دیا ہے۔ جہاں تک ان کے دھرم شاستر ہونے کا تعلق ہے اس کی بابت مسٹر آر سی۔ دت اپنی مشہور کتاب (A HISTORY OF CIVILISATION OF ANCIENT INDIA. VOL. II) میں لکھتے ہیں:۔

"ان دھرم شاستروں کے متعلق بھی ہم یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ وہ پورانک تہذیب کے آئینہ دار ہیں ان میں سے بعض تو پورانک زمانہ کے ہیں لیکن ان میں بھی مسلمانوں کی فتوحات کے زمانہ کے بعد بہت سی آمیزش ہو چکی ہے۔" (صفحہ ۱۹۷)

رامائن و مہابھارت

ان کے علاوہ ہندوؤں کے ہاں رامائن و مہابھارت بھی بڑی مقدس کتابیں سمجھی جاتی ہیں حالانکہ ان کے مضامین سے ظاہر ہے کہ وہ صرف تاریخی کتابیں ہیں (تاریخی بھی اس لحاظ سے کہ ان میں دو لڑائیوں کا ذکر ہے) ان کے زمانہ تصنیف کی تعیین بھی مشکل بلکہ ناممکن

ہے۔ عام طور پر ہندوؤں کا خیال ہے کہ رامائن مہابھارت سے بہت پہلے کی تصنیف ہے۔ پنڈت لیکھ رام صاحب تاریخ دنیا میں، مہابھارت کا زمانہ سنہ ۳۱ ق م بتاتے ہیں اور رامائن کو آٹھ لاکھ برس پرانی تصنیف قرار دیتے ہیں لیکن یورپین مؤرخین (مثل ڈاکٹر ہنٹر وغیرہ) کا خیال ہے کہ رامائن کی تصنیف کا زمانہ مہابھارت کے بعد کا ہے۔ ڈاکٹر ہنٹر کی تحقیق ہے کہ رامائن سنہ ۱۰۰۰ ق م یا اس سے بھی بعد کی ہے اور مہابھارت قریب سنہ ۱۲۰۰ ق م میں لکھی گئی لیکن ان دونوں کتابوں میں سن عیسوی کے سینکڑوں سال بعد تک الحاقات ہوتے رہے۔ چنانچہ مہابھارت میں راجہ نل کا ذکر موجود ہے جو چوتھی صدی عیسوی میں گزرا ہے۔ رامائن کے متعلق مسٹر گووند داس اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اس کی تصنیف کا زمانہ قریب تیسری صدی ق م کا ہے۔ (ہندوازم صفحہ ۱۳۷) اگرچہ ہندوؤں کے عقیدہ کی رو سے مہاراج رام چندر جی کا زمانہ آج سے قریب بیس لاکھ سال پیشتر کا مانا جاتا ہے۔ (ایضاً صفحہ ۱۶۴)

رامائن مختلف مصنفوں نے لکھی ہے۔ اٹھارہویں صدی عیسوی کے اخیر پر رامائن کے قریب بیس مختلف نسخے فقط بنارس کے ایک کتب خانہ میں موجود تھے۔ جن میں سے ہر ایک میں واقعہ متعلقہ کی بابت بہت کچھ اختلاف پایا جاتا تھا لیکن ویاس، کالی داس، ہیم چندر وغیرہ کی رامائن کے مقابلہ میں والمیکی کی رامائن بہت مشہور ہے لیکن اس کی بھی یہ حالت ہے کہ:-

"اس میں پہلا اور ساتواں باب بعد کا اضافہ ہے اور باقی تین کی بھی حالت یہ ہے کہ اس میں بے حد ردّ و بدل ہو چکا ہے۔ اگرچہ اتنا نہیں جتنا مہابھارت میں .... یہ بھی یاد رہے کہ یہ محض شاعری ہے تاریخ نہیں۔" (ہندوازم صفحہ ۳۱، ۳۲)

رامائن اور مہابھارت کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ:-

"یہ کتابیں سینکڑوں برس کے عرصہ میں جا کر متشکل ہوئیں اور اس کے بعد بھی ان میں اضافے ہوتے رہے۔"

رامائن کی تفاصیل

رامائن کی رو سے راجہ دشرتھ (مہاراج رام چندر جی کے والد بزرگوار) کی تین بیویاں اور ساڑھے تین سو لونڈیاں تھیں۔ (ہندوازم صفحہ ۱۳۳) جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، ان کی عمر ساٹھ ہزار سال کی تھی۔ جب ان کے ہاں چار لڑکے پیدا ہوئے (ص ۱۳۴) جب مہارانی سیتا کا سوئمبر رچایا گیا تو ان کی عمر پانچ برس کی تھی اور جب ان کی عمر دس ہزار تینتیس سال کی ہوئی تو ان کے ہاں پہلا لڑکا پیدا ہوا۔ (ص ۱۳۴) اس میں کس قسم کے قصے اور کہانیاں ہیں، اس کا اندازہ صرف ایک واقعہ سے لگایئے جو رام چندر جی

کی پیدائش کے متعلق ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ:۔

مہاراجہ دشرتھ کے تین رانیاں کوشلیا، کیکئی اور سومترا تھیں، لیکن کسی سے کوئی بیٹا پیدا نہیں ہوا۔ لہٰذا بیٹے کی تمنا میں راجہ نے اشومیدھ جگ کیا۔ جس کا قاعدہ یہ تھا کہ جگ کرنے والے کی رانی قربانی ہونے والے گھوڑے کو بلدان کرتی تھی اور اس گھوڑے کے ساتھ ایک رات رہتی تھی چنانچہ کوشلیا نے گھوڑے کے ساتھ مراسم ادا کئے۔ پھر گھوڑے کو جگ میں چڑھایا گیا۔ یعنی اس کی سوختنی قربانی عمل میں آئی۔ پھر کیا دیکھتے ہیں کہ جگ ویدی یعنی مذبح کی آگ میں سے ایک قوی ہیکل شخص سونے کی تھالی میں کھیر لے کر نکل آیا، اور راجہ دشرتھ سے بولا کہ یہ کھیر اپنی رانیوں کو کھلا دے۔ وہ تیرے لئے بیٹے جنیں گی۔ پس راجہ نے آدھی کھیر کوشلیا کو، آدھی باقی رانیوں کو کھلادی اور رانیاں حاملہ ہوگئیں اور وشنو جی مہاراج چار حصے ہوکر ان رانیوں سے اس طرح پیدا ہوئے کہ کوشلیا سے رام، کیکئی سے بھرت، اور سومترا سے لچھمن اور شترودھن یہ چاروں بڑے ہوئے تو رام اور لچھمن میں بہت رفاقت پیدا ہوئی۔ اسی طرح بھرت اور شترودھن آپس میں ایک دوسرے کے زیادہ رفیق تھے۔" (مقدمہ تاریخ ہند قدیم ہند، صفحہ ۱۳۸)

یہ قصہ کی ابتدا تھی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ جب لنکا فتح کرنے کے بعد مہاراج رام چندر جی اجودھیا میں واپس آئے اور مہارانی سیتا کے ساتھ اپنے دارالسلطنت میں رہنے سہنے لگے تو:۔

"ایک روز سیتا جی نے تپوبن کے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی، جہاں بالمیک رشی کا قیام تھا۔ رام نے لچھمن جی کو بلا کر حکم دیا کہ کل سیتا جی کو رتھ میں سوار کر کے تپوبن کی سیر کرالاؤ۔ یہ ایک رات وہاں قیام کریں گی، پھر واپس آجائیں گی۔ اتفاقاً رات کو ورمکھ نامی جاسوس نے حسب معمول تنہائی میں رام چندر جی کو اپنی رپورٹ سنائی اور رعایا کے حالات سے آگاہ کیا۔ اسی سلسلے میں اس نے کہا کہ آج میں نے ایک چمار اور چماری میں جھگڑا ہوتے سنا۔ چمار نہائیت حسرت کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ اب عورت کو بس میں رکھنا ہمارے لئے دشوار ہوگیا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے راجہ نے ایسا بُرا نمونہ دکھایا ہے کہ اپنی رانی کو، جو راون کے ساتھ فرار ہوگئی تھی، پھر اپنی رانی بنا کر گھر میں رکھ لیا ہے۔ جب راجہ ہی عورت کے معاملے میں اس قدر کمزور ہے تو رعایا کیوں نہ متاثر ہوگی۔ یہ حال سنا کر ورمکھ زار و قطار رونے لگا۔ رام جی بھی بہت متاثر ہوئے۔ اس کو رخصت کر کے اپنے تینوں بھائیوں کو بلا کر سب

حال سنایا اور کہا کہ میں نے اب یہ فیصلہ کیا ہے کہ صبح لچھمن جب سیتا کو پتوبن لے جائے تو یہاں کچھ نہ کہے۔ پتوبن میں پہنچا کر کہہ دے کہ رام نے تم کو طلاق دے دی ہے۔ اب رام کو تم سے کوئی تعلق نہیں۔ یہ سنا کر اور سیتا کو وہاں چھوڑ کر واپس چلا آئے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور سیتا جو حاملہ بھی تھی، بے یار و مددگار اس جنگل میں روتی ہوئی رہ گئی۔ بالمیک رشی کو معلوم ہوا، تو وہ اپنی جھونپڑی میں لے گئے۔ وہاں سیتا کے دو جڑواں بیٹے پیدا ہوئے۔ جن کے نام تو اور کش رکھے گئے۔ یہ دونوں لڑکے بالمیک رشی کے پاس پتوبن میں پرورش پا کر جوان ہوئے اور بالمیک جی نے، جو اسی عرصے میں رام چندر جی کی مذکورہ داستان یعنی رامائن تصنیف کر رہے تھے، ان دونوں لڑکوں کو زبانی یاد کرادی۔ ادھر رام چندر جی چند روز کے بعد سیتا کو بھول گئے اور اپنے کاروبارِ ریاست میں مصروف ہوئے۔ ایک روز ایک برہمن نے آکر عرضی دی کہ میرا بیٹا چھوٹی ہی عمر میں فوت ہو گیا ہے۔ یہ دلیل اس بات کی ہے کہ آپ کے راج میں کوئی خرابی ہے۔ رام چندر جی یہ سن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور رات دن اسی تلاش میں رہنے لگے کہ میرے راج میں کون سی خرابی ہے۔ آخر انہوں نے ایک تالاب کے کنارے ایک سنیاسی کو دیکھا کہ سر نیچے اور پاؤں اوپر کئے ہوئے ایک درخت میں لٹکا ہوا ہے۔ رام نے پوچھا تو کون ہے اور ریاضت کیوں کر رہا ہے۔ سنیاسی بولا۔ "میں ذات کا شودر ہوں، میں نے اس لئے یہ سخت مجاہدہ اختیار کیا ہے کہ اسی جسم کے ساتھ سورگ (بہشت) میں پہنچوں۔" یہ سن کر رام چندر جی کو بہت غصہ آیا اور یہ کہتے ہوئے کہ او پاپی تو شودر ہو کر دوج ورن' یعنی اونچی ذات والوں کے کام کر رہا ہے۔ تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا سر اڑا دیا۔ یہ حسن عمل دیکھ کر دیوتاؤں نے اظہار خوشنودی کے لئے رام چندر پر پھول برسائے۔ چند برسوں کے بعد رام چندر جی نے اشومیدھ جگ (گھوڑے کی قربانی) کا سامان کیا۔ اس متبرک جشن میں شریک ہونے کے لئے تو اور کش بھی درویشانہ لباس میں والمیک جی کے حسب منشا اجودھیا پہنچے اور رام چندر جی کو رامائن کے اشعار جو ان کو یاد تھے، سنائے۔ جب رام چندر جی کو معلوم ہوا کہ یہ دونوں نوجوان انہی کے بیٹے ہیں تو انہوں نے سیتا جی کو بلانے کا ارادہ کیا۔ دوسرے روز سیتا جی بھی بالمیک جی کے ہمراہ آگئیں اور بالمیک جی نے مجمع عام میں سیتا جی کی پاک دامنی کی گواہی دی۔ رام چندر جی نے کہا کہ اس میں شک نہیں کہ بالمیک جو کچھ فرماتے ہیں، وہ صحیح ہے لیکن ضرورت اس کی ہے کہ خود سیتا جی اپنی پاک دامنی

کاکوئی ناقابلِ اشتباہ ثبوت پیش کریں۔ سیتاجی نے اٹھ کر قسم کھائی کہ میں نے رام کے سوا کسی دوسرے شخص کا خیال بھی نہیں کیا اور اے دھرتی ماتا تو میرے اس بیان کی صداقت کا ثبوت پیش کر کے مجھے ابھی نگل جا۔ سیتاجی کا یہ کہنا تھا کہ زمین پھٹی اور اس میں سے ایک تخت نکلا۔ سیتاجی فوراً اس پر بیٹھ گئیں اور تخت مع سیتاجی زمین میں سما گیا۔ اس طرح سیتاجی کا خاتمہ ہؤا۔ اس واقعہ کے دس ہزار سال بعد تک رام چندر جی زندہ اور برسرِ حکومت رہے۔"

(مقدمہ تاریخ ہند قدیم، صفحہ ۱۴۸۔ ۱۵۰)

اور اس قسم کی باتیں بھی لکھی ہیں:۔

برہما کی بیٹی اہلیا جو گوتم رشی کی بیوی تھیں۔ اس کے ساتھ اندر دیوتا نے جو گوتم رشی کے شاگرد تھے۔ نامناسب برتاؤ کیا اور گوتم رشی نے اندر کو بددعا دی، جس سے ان کے جسم پر ایک ہزار علامات تانیث نمودار ہوگئیں اور اہلیا کو پتھر کا بنا دیا۔" (ایضاً، صفحہ ۱۳۸)

ہندوؤں کے ہاں رسول کا صحیح تصور کہیں نہیں ملتا۔ وہ اپنے مشاہیر کو خدا کا اوتار سمجھ کر ان کی پرستش کرتے ہیں چنانچہ رام چندر جی کی بھی اسی طرح پرستش ہوتی ہے لیکن اب خود ہندوؤں کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہو رہا ہے کہ ایک انسان کس طرح سے خدا ہو سکتا ہے؟ ہندوؤں کے سیاسی اور مذہبی راہ نما، مہاتما گاندھی 'رام نام' کی پرستش کیا کرتے تھے اور اپنی پرارتھنا میں اس کی تلقین بھی کرتے تھے۔ اس ضمن میں ذیل کا سوال اور اس کا جواب ان کے اخبار ہریجن بابت ۲۲، ستمبر ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئے تھے۔ سوال کرنے والا ایک ہندو تھا اور جواب مہاتما گاندھی کے قلم سے تھا:۔

سوال:۔ وہ رام، جسے آپ (مہاتما گاندھی) غیر فانی سمجھتے ہیں، کس طرح دسرتھ کا بیٹا اور سیتا کا خاوند ہو سکتا ہے؟

جواب:۔ سنت تلسی نے بھی یہ سوال اٹھایا ہے اور اس کا خود ہی جواب بھی دیا ہے۔ اس جواب کو عقلی طور پر سمجھایا نہیں جا سکتا۔ اس سے عقلی تشفی نہیں ہو سکتی۔ یہ تو دل کی بات دل سے ہے۔ میں بھی ابتدا میں اس رام کی پرستش کرتا تھا جو سیتا کا خاوند ہے لیکن جوں جوں خدا کے متعلق میرا علم اور تجربہ بڑھتا گیا، وہ رام غیر فانی اور حاضر و ناظر ہوتا گیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اب وہ رام سیتا کا خاوند نہیں رہا لیکن رام کے تصور کی وسعت سے سیتا کے خاوند کا مفہوم بھی وسیع ہوتا چلا گیا......

.....اس شخص کے لئے رام کبھی حاضر و ناظر نہیں ہو سکتا جو اسے صرف دسرتھ کا بیٹا سمجھتا ہے لیکن جو شخص رام کو خدا سمجھتا ہے۔ اس کے لئے اس حاضر و ناظر خدا کا باپ بھی حاضر و ناظر ہو جاتا ہے۔ باپ اور بیٹا ایک ہو جاتے ہیں...... جب ہمیں صحیح علم ہو جاتا ہے تو انسان کی حقیر سی خودی فنا ہو جاتی ہے اور سب کچھ خدا ہو جاتا ہے۔ اس وقت رام دسرتھ کا بیٹا، سیتا کا خاوند، بھرت اور لکھشمن کا بھائی ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا اور اس کے باوجود غیر مخلوق اور ازلی خدا بھی ہوتا ہے..... رام کا مسئلہ کیسا ہے جو عقلی حدود سے ماوراء ہے۔"

یہ جواب کسی تبصرہ کا محتاج نہیں۔

مہابھارت

مہابھارت کو ویاس جی کی تصنیف بتایا جاتا ہے۔ جنہوں نے اس جنگ کے حالات بچشم خویش دیکھ کر لکھے تھے۔ اگر یہ صحیح ہے تو مہابھارت کی جنگ کا واقعہ قریب ۶۰۰ سنہ ق۔م قرار دیا جا سکتا ہے۔ مہابھارت کے موجودہ نسخوں کے متعلق مسٹر گووندداس لکھتے ہیں:۔

"ان میں بڑے بڑے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ تین مختلف مرتب شدہ کتابوں کا ذکر تو خود مہابھارت کے اندر موجود ہے۔" (ہندوازم۔ صفحہ ۱۴۱)

اس کتاب میں ہستناپور کی ریاست کے لئے دو رشتہ دار خاندانوں (کورو پانڈو) کی جنگ کا ذکر ہے جو اٹھارہ دن تک رہی اور جس میں کہا جاتا ہے کہ مختلف اندازوں کے مطابق (۹۹، ۶۷، ۸۲) آدمی مارے گئے۔ (ہندوازم، صفحہ ۱۴۱) مہابھارت کے متعلق خود اس کے آدھ پرب ادھیائے اوّل میں لکھا ہے کہ پہلے زمانہ میں دیوتاؤں نے مل کر ترازو کے ایک پلڑے میں چار وید اور دوسرے میں مہابھارت کو رکھا۔ مہابھارت کا وزن چاروں ویدوں سے زیادہ نکلا۔ نیز اس میں لکھا ہے کہ اس کتاب میں پورے ساٹھ لاکھ اشعار ہیں، جن میں سے تیس لاکھ اشعار دیولوک (عالم بالا) میں پڑھے جاتے ہیں۔ پندرہ لاکھ پتری لوک میں، چودہ لاکھ گندھرو لوک میں اور باقی ایک لاکھ منش لوک (انسانوں کی دنیا) میں۔ اس سے ظاہر ہے کہ جو مہابھارت اس دنیا میں موجود ہے، اس کے ایک لاکھ اشعار ہیں لیکن لیبان نے ان اشعار کی گنتی دو لاکھ پندرہ ہزار بتائی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ مہابھارت میں مختلف ادوار میں اضافے ہوتے رہے ہیں۔ چنانچہ بھگوت گیتا، شکنتلا، رگھوبنس، میگھ دوت وغیرہ متعدد رسالے مہابھارت کا جزو بن چکے ہیں۔ مہابھارت میں لکھا ہے کہ دروپدی کے پانچ خاوند تھے۔

۱۔ یدھشٹھر، ۲۔ بھیم سین، ۳۔ ارجن، ۴۔ نکل، ۵۔ سہدیو۔ اور ان پانچوں خاوندوں سے ایک ہی بیوی، دروپدی سے علی الترتیب پانچ بیٹے بھی پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ مہاراجہ یدھشٹر کے فرزند کا نام (۱) برتی وندیہ اور بھیم سین کے ارجمند کا نام (۲) سوت سوم اور مہاراجہ ارجن کے بیٹے کا نام (۳) شرت کرما اور نکل کے برخوردار کا نام (۴) شتانیک، جس کا ذکر اتھروید کانڈا سوکت ۳۵ نمبر ا میں بھی پایا جاتا ہے اور سہدیو کے بیٹے کا نام (۵) شرت آشن لکھا ہے۔ چنانچہ جب راجہ دروپد اپنی بیٹی کے پانچ خاوند سن کر افسوس کرنے لگا تو مہرشی ویاس جی نے فرمایا۔ اسے دروپد! تو افسوس نہ کر کیونکہ ایک عورت کے ایک ساتھ اینک (متعدد) خاوند ہونا عین ویدک دھرم ہی ہے۔" (مہابھارت آدی پرت ادھیائے نمبر ۱۹۷ وغیرہ ——— بحوالہ ویدارتھ پرکاشس صفحہ ۱۴۳)

ایک عورت کے متعدد خاوندوں کے متعلق دیگر مقامات سے بھی شواہد ملتے ہیں۔ مہابھارت ملی میں لکھا ہے کہ پرانوں کی روایت کے مطابق نرپسی کنیا سے سات رشیوں نے ایک ساتھ بیاہ کیا تھا۔ نیز دارکشی نامی منی کنیا سے پرچیتا نامی دس برہمن بھائیوں نے ایک ساتھ نکاح کیا تھا۔ یہ بھائی ویدوں کے مصنف (رشی) بھی ہیں۔
(ویدارتھ پرکاشس، صفحہ ۱۴۳)

نیز مہابھارت ادیوک پرب ادھیائے ۱۲۰-۱۱۰ میں لکھا ہے کہ:-

" گالب منی اپنے گورو وشوامتر رشی گورو کو وکشنا دینے کے لئے نہش کے بیٹے بیاتی راجہ کے پاس کالے کانوں والے آٹھ سو گھوڑے مانگنے کے لئے گئے۔ بیاتی نے ایسے گھوڑے نہ ہونے سے معذور ہو کر اپنی خوبصورت بیٹی مادھوی نامی گالب کے حوالے کر کے کہا کہ میرے پاس تو شیام کرن یعنی کالے کانوں والے آٹھ سو گھوڑے نہیں ہیں۔ اس لئے تو میری بیٹی کو دے کر ایسے گھوڑے لے جا۔ گالب پہلے مادھوی کو کاشی کے راجہ ہریشو کے پاس لے گیا اور اس سے بیاہ کر کے ۲۰۰ کالے کانوں والے گھوڑے حاصل کئے۔ چنانچہ راجہ ہریشو جب مادھوی سے وسومنا نامی بیٹا پیدا کر چکا تو پھر گالب منی نے مادھوی کا بیاہ دوددواس راجہ سے کر کے ۲۰۰ مزید گھوڑے حاصل کئے اور جب راجہ دوددواس بھی مادھوی سے پرترون نامی بیٹا پیدا کر چکا ۔ تب پھر گالب منی نے مادھوی کا بیاہ راجہ اشی نر سے کر کے ۲۰۰ مزید شیام کرن گھوڑے حاصل کئے اور جب اشی نر بھی مادھوی سے شوی

نامی بیٹا پیدا کر چکا تو پھر گالب منی چھ سو شیام کرن گھوڑے اور مادھوی کو اپنے گرو وشوامتر کے پاس لے گیا۔ وشوامتر نے کہا کہ اے گالب! تم نے پہلے ہی اس خوبصورت لڑکی جیسے ہش بہا ہیرے کو مجھے ہی کیوں نہ دے دیا۔ ایسا ہونے سے میں آپ ہی کیوں نہ کل پوتر کرنے والے چار پتروں کو اتپن (پیدا) کر لیتا۔ جو ہو اس وقت ایک ہی بیٹا پیدا کرنے کے لئے اس خوبصورت لڑکی سے بیاہ کرتا ہوں۔" چنانچہ وشوامتر جیسے مرتاض رشی نے بھی مادھوی سے بیاہ کر کے جب اشٹک نامی بیٹا پیدا کر لیا تو پھر اسی مادھوی کا سوئمبر رچنے کے لئے اس کے دونوں بھائی پریاگ (الہ آباد) گئے اور مادھوی کا نکاح ارینہ نامی راجہ سے کر دیا گیا۔ اس طرح مادھوی بنت یپاتی کے پانچ خاوند۔ (۱) ہر کیشو، (۲) دودواس، (۳) اشی نر، (۴) وشوامتر، (۵) ارینہ نامی تھے۔ جن میں سے پہلے چاروں بیٹے (۱) دسومنا، (۲) برتروں، (۳) شوی، (۴) اسٹک پیدا ہوئے۔

(ویدارتھ پرکاش صفحہ ۴۲ - ۱۴۱)

رامائن کی طرح مہابھارت کے متعلق بھی اب ہندوؤں کے دلوں میں طرح طرح کے شکوک وشبہات پیدا ہو رہے ہیں۔ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، یہ جنگ چچازاد بھائیوں میں تخت وتاج کے جھگڑے پر واقع ہوئی تھی لیکن اسے مقدس قرار دیا جاتا ہے۔ اس باب میں بھی مہاتما گاندھی کے اخبار ہریجن (بابت ۱۲/۴۸ ۲۲) میں حسب ذیل سوال و جواب شائع ہوئے تھے۔

سوال:۔ مہابھارت کی جنگ کو دھرم یدھ یعنی مقدس جنگ کہا جاتا ہے، حالانکہ یہ جنگ باہمی خون خرابہ سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ یوں سمجھئے کہ جیسے آجکل سول وار (خانہ جنگی) یا رشتہ داروں کی جنگ ہو جائے کیا اسی جنگ کو حق وصداقت کی جنگ کہا جا سکتا ہے؟

جواب:۔ مہابھارت کی جنگ ایک خاندانی جھگڑا تھا جو تخت وتاج کے حق کے سوال پر دو شاہی خاندانوں میں برپا ہوا اور اس زمانہ کے آئین وجدل کے مطابق لڑا۔۔۔۔۔۔ اس زمانہ میں یہ رواج تھا کہ جو لڑائی اس وقت کے آئین جنگ کے مطابق لڑی جائے، اسے حق وصداقت کی جنگ کہہ دیا جائے۔ یعنی وہ جنگ جو آئین (دھرم) کے مطابق لڑی جائے۔

اس سے بھی آگے بڑھئے تو مہاتما گاندھی، مہابھارت کے واقعہ کو تاریخی واقعہ ہی تسلیم نہیں کرتے۔ انہوں نے لکھا تھا۔

میرے خیال میں مہابھارت ایک تمثیل ہے، تاریخ نہیں ہے۔ دروپدی کے (پانچ خاوندوں) سے مراد روح کا حواسِ خمسہ کے ساتھ تمسّک ہے۔" (ہریجن بابت ۴۶ء ۴)

پنڈت جواہرلال نہرو اس باب میں لکھتے ہیں :۔

"رامائن اور مہابھارت کا زمانہ تصنیف متعیّن کرنا مشکل ہے .... اتنا ظاہر ہے کہ انہیں بہت سے مصنفوں نے لکھا اور بعد میں بہت سے زمانوں میں اضافے ہوتے رہے ..... مہابھارت میں ویدوں کی شرک کی تعلیم، اُپ نشدوں کے وحدتِ وجود، مذہب فطرت (یعنی خدا پر ایمان لیکن وحی سے انکار) کا مسلک، ثنویت اور توحید ہر قسم کی تعلیم ملتی ہے۔ اس میں گائے اور بچھڑے کے گوشت سے معزز مہمانوں کی تواضع کا تذکرہ بھی ہے۔"

(THE DISCOVERY OF INDIA. PP. 81-83)

مہابھارت میں بھاگوت گیتا بھی شامل ہے۔ گیتا کا تذکرہ آجکل عام طور پر کیا جاتا ہے۔ یہ کتاب سری کرشن جی مہاراج کی طرف منسوب کی جاتی ہے یعنی یہ مجموعہ ہے، ان نصائح کا جو سری کرشن جی مہاراج نے میدانِ کارزار میں ارجن کو کیں لیکن ڈاکٹر داس گپتا کی تحقیق کے مطابق گیتا کوئی مستقل تصنیف نہیں بلکہ اس میں بہت کچھ اُپ نشدوں سے مستعار لیا گیا ہے۔ (داس گپتا، جلد دوم، صفحہ ۴۷۸) گیتا کے متعلق یہ طے نہیں ہو سکا کہ یہ کس عہد کی تصنیف ہے اور جب زمانۂ تصنیف کا تعین نہیں ہو سکا تو پھر مصنف کے متعلق بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ ڈاکٹر داس گپتا کا بیان ہے کہ بھگوت گیتا میں برہم سوتر کا حوالہ موجود ہے اور برہم سوتر دوسری صدی قبل مسیح کے بعد کی تصنیف قرار دی جا سکتی ہے۔ تحقیق یہ ہے کہ بھگوت گیتا دراصل 'EKANTI VAISNARAS' کی تصنیف ہے۔ (داس گپتا، جلد اوّل، صفحہ ۲۱ - ۴۲۲) اس تحقیق کی رُو سے سری کرشن جی مہاراج کی طرف اس کا انتساب بھی صحیح نہیں رہتا۔ گیتا میں عمل اور حرکت کی تعلیم دی گئی ہے اور یہ اُس جمود و تعطل کا ردِ عمل ہے جو یوگ اور ویدانت کے ہندی تصوف کی رُو سے ہندو قوم کے رگ و پے سرایت کر چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ہندو قوم اپنی نشاۃِ ثانیہ کے لئے سری کرشن جی مہاراج ہی کو اپنی زندگی کا نمونہ قرار دے رہی ہے اور گیتا کی تعلیم عام ہو رہی ہے۔ اور دیگر کتبِ مقدسہ (حتیٰ کہ وید بھی) پسِ پشت ڈالے جا رہے ہیں، لیکن سری کرشن جی مہاراج کے متعلق بھی ان کے ہاں عجیب و غریب روایات ہیں۔ ان میں سے ہم صرف ایک ڈائیٹ درج

کرتے ہیں۔ مہابھارت میں ہے۔

وشوامتر، کنوا، اور نارد تینوں رشی دوارکا میں آئے۔ چند نوجوانوں نے ان رشیوں سے اس طرح تمسخر کیا کہ کرشن جی کے ایک بیٹے سانب کو عورت کا لباس پہنا کر ان کے سامنے لائے اور کہا کہ یہ عورت حاملہ ہے۔ آپ بتائیں کہ اس کے پیٹ سے کیا پیدا ہوگا۔ رشیوں نے ناراض ہوکر غصہ کی حالت میں کہا کہ اس سے لوہے کا موسل پیدا ہوگا۔ جس سے جادو بنس (کرشن جی) کے خاندان کی تباہی ہوگی۔ دوسرے ہی دن سانب سے لوہے کا ایک موسل پیدا ہوا۔ اگر سین نے اپنے خاندان کو بربادی سے بچانے کے لئے اس موسل کو تڑوا کر باریک باریک ذرات بنوائے اور ان کو سمندر میں پھنکوا دیا۔ وہ ذرات سمندر کے کنارے آکر جم گئے۔ جن سے بکثرت جھاڑ جھنکاڑ پیدا ہوگئے۔ ان ذرات میں ایک لوہے کا ٹکڑا اتفاقاً باریک ہونے سے رہ گیا۔ اس کو ایک مچھلی نگل گئی۔ مچھلی ایک شکاری کے ہاتھ آئی۔ اس کو مچھلی کے پیٹ میں سے .... لوہے کا ٹکڑا ملا۔ اس نے اس سے تیر کا ایک پیکان بنایا، چند روز کے بعد تمام جادو بنسی مع کرشن مہاراج سمندر کے کنارے بغرض سیر و تفریح گئے، وہاں سب نے شراب پی۔ شراب کے نشے میں ایک دوسرے کو قتل کرنے لگے۔ کرشن جی نے سمندر کے کنارے سے جھاڑ جھنکاڑ اکھیڑ لئے۔ جو ان کے ہاتھ میں آتے ہی ایک موسل کی شکل میں تبدیل ہوگئے۔ کرشن جی نے اس موسل سے باقی ماندہ بنسیوں کو ہلاک کر دیا۔ اس کے بعد کرشن جی ایک جھاڑ میں میں جا بیٹھے۔ ان کا جسم درختوں میں بالکل چھپ گیا تھا مگر پاؤں کا ایک تلوا دور سے نظر آتا تھا۔ اتفاقاً وہی مذکورہ شکاری اس طرف کو گزرا اور کرشن جی کے تلوے کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ اس جھاڑی میں کوئی ہرن بیٹھا ہے۔ چنانچہ اس نے تاک کر تیر چلایا۔ تیر نشانے پر صحیح بیٹھا۔ اور کرشن جی کا کام تمام ہوا۔" (مقدمہ تاریخ ہند قدیم صفحہ ۱۳۶)

باقی رہی سری کرشن جی مہاراج کی تعلیم، آپ کی عملی جدوجہد اور اس کے نتائج، سو اس کے متعلق خود ہندو لیڈروں کی آراء قابل غور ہیں۔ اخبار تیج کے کرشن نمبر بابت، ستمبر ۱۹۳۹ء میں پنڈت گنگا پرشاد اپادھیائے نے لکھا تھا۔

"ویدک دھرم مٹ چکا تھا۔ اس کا صرف نام باقی تھا...... ایسے وقت میں سری کرشن نے ویدک تہذیب کو نیست و نابود ہونے سے بچانے کے لئے جو جدوجہد کی، اس کی مثال دنیا کی تاریخ میں دوسری نہیں ملتی۔ یہ سچ ہے کہ کرشن جی کو دھرم کے محفوظ رکھنے میں وہ کامیابی نصیب نہیں ہوئی جو ان کی کوششوں

سے مطابقت رکھ سکے۔ جو گراوٹ سری کرشن جی کی زندگی سے پہلے شروع ہوئی۔ وہ اب تک جاری ہے۔"

اور سوامی دیانند جی لکھتے ہیں:۔

"مہابھارت کی جنگ میں نہ صرف آریہ کشتری ہی بلکہ آریہ برہمن بھی بالکل نیست و نابود ہو گئے۔ یہ بات سری کرشن جی کی آخری سوانح عمری سے بھی واضح ہو جاتی ہے...... لیکن آریہ جاتی کے اپنے اندرونی نقائص محض جنگی فتح سے دور نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے لئے تو ایک معقول مدبرانہ علاج کی ضرورت تھی۔ اس وقت ایسا ڈاکٹر آریہ جاتی کو نصیب نہ ہوا اور شری کرشن جی اپنا کام پورا کئے بغیر ہی اس جہاں سے کوچ کر گئے۔ اگر ان کی ابتدائی کوشش یدھشٹر اور دریودھن میں مصالحت پیدا کر سکتی تو وہ ویدک تہذیب کو از سرِ نو قائم کرنے کا تعمیری کام کر سکتے......... اور مہابھارت کی جنگ اتنی عظیم جنگ ہوئی کہ یدھشٹر کی عالی شان فتح آریہ جاتی کو اس کی شکست سے بھی زیادہ مہنگی پڑی۔"

شری کرشن جی مہاراج کو بھی خدا کا اوتار سمجھ کر ان کی پرستش کی جاتی ہے لیکن اب رفتہ رفتہ انہیں بھی انسان سمجھا جانے لگا ہے۔ ہریجن میں ایک صاحب نے سوال کیا تھا کہ جب جنگ مہابھارت میں کرشن جی نے قسم اٹھائی تھی کہ وہ ہتھیار کا استعمال نہیں کریں گے تو پھر انہوں نے بھیشم کے خلاف سدرشن چکر کیوں چلایا تھا۔ اس کے جواب میں لکھا تھا:۔

"اگر قسم توڑنے کا یہ واقعہ درست ہے تو اس کا یہی مطلب ہے کہ کرشن جی اتنی بڑی ہستی ہونے کے باوجود انسان ہی تھے اور غلطی کر سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مہابھارت میں یہ بھی لکھا ہے کہ کرشن جی کی اس فروگزاشت پر بھیشم نے انہیں شرم دلائی اور ان کے شاگرد اور دوست ارجن نے انہیں اس سے بروقت روک دیا۔"

(ہریجن بابت ۲۲/۱۲/۴۶)

گیتا کی تعلیم کے متعلق پنڈت جواہر لال نہرو رقمطراز ہیں:۔

"آج ہر فلسفہ اور فکر کے مختلف مدعی گیتا ہی کو اپنی توجہات کا مرکز بنائے ہوئے ہیں اور ہر ایک اپنے اپنے مطلب کے مطابق تفسیر کر رہا ہے (حتیٰ کہ) گاندھی جی (اگر) اپنے عقیدۂ اہنسا کی بنیاد گیتا پر رکھتے ہیں، تو ایسے لوگ بھی ہیں، جو ہنسا (تشدد) اور جنگ کا جواز بھی اسی سے ثابت

کرتے ہیں۔"

(THE DISCOVERY OF INDIA. P.83)

گذشتہ صفحات میں جو کچھ بیان ہوا ہے۔ وہ ہندوؤں کے آستک گروہ سے متعلق ہے جو ویدوں کو مانتا ہے۔ دوسرا گروہ ناستک ہے۔ جو نہ خدا کو مانتا ہے نہ ویدوں کو (لیکن بایں ہمہ یہ بھی ہندو ہی ہیں) ان میں بدھ اور جینی زیادہ مشہور ہیں۔

بُدھ مت

بُدھ مت کے بانی مہاتما گوتم (بدھ) قریب ۵۶۰ء ق.م میں پیدا ہوئے۔ ان کا مذہب درحقیقت ردّعمل تھا "برہمنوں کے استبداد اور ان کے رسم و رواج پر مبنی مذہب کے خلاف۔ قریب اسّی (۸۰) سال کی عمر میں انہوں نے وفات پائی۔ آپ کی سب تعلیم زبانی تھی۔ اس لئے اپنی وفات کے وقت انہوں نے کوئی کتاب نہیں چھوڑی۔ ان کی تعلیم ان کی وفات کے سینکڑوں سال بعد تک بھی مدوّن نہیں ہوئی تھی۔ بدھ مت کا لٹریچر پالی زبان میں ہے اور تین مجموعوں پر منقسم۔

۱۔ سُتّہ 'SUTTA' معتقدات سے متعلق۔

۲۔ ونایا 'VINAYA' بھکشوؤں کی زندگی کے متعلق آئین و ضوابط اور

۳۔ ابھی دھما 'ABHI DHAMMA' معتقدات سے متعلق فنّی اور علمی انداز کا مجموعہ۔

بُدھ مت کی تاریخ کے علماء و محقّقین ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ اس لٹریچر کی تدوین و ترتیب کا زمانہ کون سا ہے۔ چنانچہ قیاس ہے کہ یہ مجموعے تیسری صدی قبل مسیح میں مرتّب ہوئے۔ (داس گپتا۔ صفحہ ۱۱۲۔ ۸۲)

عیسائیت سے متعلقہ باب میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ اس مذہب کی کتبِ مقدّسہ کی تدوین و ترتیب کے لئے کونسلیں منعقد ہوتی تھیں۔ یہی بدھ مت کے ساتھ بھی ہوا۔

بدھ کی وفات کے بعد اس کے مشہور شاگردوں کی ایک کونسل مدعو کی گئی تاکہ وہ اس مت کے نصاب اور تعلیم کو منضبط کرے۔ ان میں سے تین شاگرد منتخب کئے گئے تاکہ وہ اس تعلیم کو، جو انہوں نے اپنے اُستاد سے سُنی تھی، ضبطِ تحریر میں لائیں۔ پہلے نے ضابطۂ زندگی سے متعلق تعلیم کو دُہرایا۔ اُپالی نے رسوم و اخلاق سے متعلّق حصّہ کو بیان کیا۔ انند نے معتقدات سے متعلق اپنے اُستاد کے ارشادات پیش کئے۔ کونسل سات ماہ تک منعقد رہی اور اس کے بعد بدھ مت کے متعلق تین شاخوں میں منقسم تعلیم معرضِ وجود میں آگئی۔

بدھ کی وفات کے قریب ایک سو سال بعد ایک اور کونسل منعقد ہوئی تاکہ وہ ان اغلاط و اباطیل کو زائل کرے جو رفتہ رفتہ اس کی تعلیم میں داخل ہو گئیں تھیں۔ یہ تجویز ہؤا کہ کھانے پینے، منشیات اور دان میں سونا چاندی لینے کے متعلق احکامات میں ترمیم کی جائے۔ اس الحاد کی پاداش میں دس ہزار بھکشوؤں کا تنزل کر دیا گیا اور انہوں نے ایک نیا فرقہ بنا لیا۔

بادشاہ اشوک کے زمانہ میں تیسری کونسل منعقد ہوئی، اور انہوں نے ساٹھ ہزار بھکشوؤں کو الحاد کے الزام میں مت سے خارج کر دیا۔ (THE GREAT RELIGIONS, BY REV. J. FREEMAN).

فرقے یوں تو بدھ مت میں آج بہت سے فرقے موجود ہیں لیکن ان میں دو فرقے سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ یعنی شمالی اور جنوبی۔

جنوبی فرقہ کی کتابیں وہی ہیں، جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ شمالی فرقہ کی مقدس کتاب للیتا دسترا ہے۔ یہ کتاب دورِ حاضرہ کی پیداوار نہیں۔ کتاب 'BUDHAGHOSA' کی تصنیف کے وقت (یعنی قریب ۴۰۰ء میں) بھی یہ موجود تھے۔ ان کی کتابوں میں باہمی بے حد تضاد ہے۔ بدھ مت خدا کی ہستی کا منکر ہے۔ (اسی سے ظاہر ہے کہ جس شکل میں یہ مذہب آج موجود ہے۔ اس کی تعلیم کبھی الہامی نہیں ہو سکتی) مہاتما بدھ کی طرف منسوب کردہ تعلیم میں بھی عجیب و غریب خلافِ عقل اور خلافِ واقعہ باتیں ملتی ہیں۔ مثلاً دنیا کے بیچ میں ایک پہاڑ ہے، جس کی لمبائی تیرا لاکھ چوالیس ہزار میل ہے۔ (حالانکہ ظاہر ہے کہ ہمارے کرۂ ارض کا کل محیط ۲۵۰۰۰ میل سے زیادہ نہیں) یا مثلاً یہ کہ جب مہاتما بدھ سوائتھی میں مقیم تھے تو ایک دیوتا آسور راہو نامی نے چاند کو پکڑ لیا۔ چاند نے مہاتما بدھ کی دہائی دی۔ بدھ نے راہو کو حکم دیا کہ وہ چاند کو چھوڑ دے۔ چنانچہ راہو نے چاند کو چھوڑ دیا اور اس پر اس قدر خوف طاری ہؤا کہ اس کے سر کے بال کھڑے ہو گئے اور وہ بھاگ گیا۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے بدھ مت کی تعلیم کی رُو سے مہاتما بدھ خدا کی ہستی کے منکر تھے لیکن اب ہر جگہ مہاتما بدھ کے بُت کی پرستش ہوتی ہے۔ یعنی اب انہیں خود خدا بنا لیا گیا ہے۔

جین مت

جین مت کے بانی مبانی مہاتما مہاویر، مہاتما بدھ کے ہمعصر تھے اور یہ مذہب بھی برہمنیت کے خلاف صدائے احتجاج تھا۔ جینیوں کے عقیدہ کی رُو سے جین مت ازلی ہے اور یہ پیغام مختلف ادوار میں (TIN THAN-KARA) کی معرفت آتا رہا ہے۔ مہابیر آخری ترتھنکر تھے۔ ان سے ۲۵۰ سال پہلے ایک اور ترتھنکر آیا تھا لیکن اس سے پہلا ترتھنکر قریب ....۸۴ سال پیشتر آیا تھا۔ آخری ترتھنکر (یعنی مہاتما مہاویر) اس سلسلہ کی چوبیسویں کڑی تھے۔ جین مت میں خدا کا انکار ہے لیکن ان ترتھنکروں کو خدا سمجھ کر ان کی پرستش ہوتی ہے۔ (داس گپتا ص ۱۷۰) اس مت کے دو مشہور فرقے ہیں۔ سوتمبر (سفید لباس پہننے والے) اور ڈگمبر (ننگے رہنے والے) سوتمبر کا دعویٰ ہے کہ مہاتما مہاویر کی اصلی تعلیم ان کے پاس ہے لیکن ڈگمبر کہتے ہیں کہ ان کی اصلی تعلیم ان کے ساتھ ہی ضائع ہو گئی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس امر کے بھی مدعی ہیں کہ اصل فرقہ ڈگمبر ہی ہے اور جو معتقدات و رسومات ان کے ہاں جاری ہیں، وہ اصل سرچشمہ سے ماخوذ ہیں۔ رفتہ رفتہ ان میں اور فرقے بھی پیدا ہو گئے، جن کی تعداد چوراسی (۸۴) تک بتائی جاتی ہے۔ جینیوں کے نزدیک شروع میں (۱۴) پروَ اور (۱۱) انگ مقدس کتابیں تھیں۔ پروَ کچھ عرصہ کے بعد بالکل کھو گئی۔ اب صرف ایک باقی ہے۔ (جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے، ڈگمبر ان کی اصلیت کے بھی منکر ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ سوتمبر فرقہ کی خانہ ساز (کتابیں ہیں)۔ اس مت میں سادھو کی زندگی سب سے بہتر زندگی ہے، جس کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ ضروریاتِ زندگی سے اپنے پاس کچھ نہ رکھے اور بھیک مانگ کر گزارہ کرے۔ ان کی تمام متاع ستر پوشی کے کپڑے، کمبل، کشکول، جھاڑو اور ایک کپڑے کے ٹکڑے پر مشتمل ہوتی ہے جس سے وہ اپنا منہ ڈھانپے رکھتے ہیں تاکہ کوئی کیڑا مکوڑا اندر نہ چلا جائے اور اس طرح جیو ہتیا (جانداروں پر ظلم) ہو جائے۔ ڈگمبر کپڑوں سے بھی بے نیاز رہتے ہیں۔ ان کی ریاضتیں بڑی جان کاہ ہوتی ہیں۔ حتیٰ کہ دن رات میں صرف تین گھنٹے تک سونے کی اجازت ہے۔ سوامی دیانند کا بیان ہے کہ جینیوں نے اپنی قوت کے زمانہ میں وید وغیرہ قسم کی جتنی کتابیں پائیں، انہیں تلف کر دیا۔ اور ان کی تعلیم کو بھی برباد کر دیا۔ (ستیارتھ پرکاش) ان کے ہاں

بھی توہم پرستی کی عجیب وغریب داستانیں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کے تری تھنکر کا قد پانچ سو بانس کا تھا، اور اس کی عمر چوراسی (۸۴) لاکھ سال تھی۔ دوسرے تری تھنکر کا قد چار سو بانس رہ گیا اور عمر بہتر لاکھ سال۔ پھر رفتہ رفتہ یہ تعداد کم ہوتی گئی۔

تصریحاتِ بالاسے یہ حقیقت ہمارے سامنے آگئی ہے کہ ہندو مذہب میں کوئی مقدّس کتاب ایسی نہیں جس کے متعلق یہ حتمی اور یقینی طور پر کہا جا سکے کہ یہ من وعن وہی اور ویسی ہی ہیں، جیسی ان کے مذہب کے بانی نے انہیں دی تھی۔ (اور ان کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے، وہ خود اس امر کی زندہ شہادت ہے کہ ایسی تعلیم کبھی آسمانی تعلیم نہیں قرار دی جاسکتی[1]) وہ تو خیر پھر بھی پرانے زمانے کی بات ہے، ان کے ہاں تو کیفیت یہ ہے کہ آریہ سماج فرقہ دورِ حاضرہ میں وجود میں آیا ہے۔ اس کے بانی سوامی دیانند نے اپنی زندگی میں اپنی کتاب ستیارتھ پرکاش چھاپ کر (۱۸۷۵ء میں) شائع کی۔ اس کے بعد اس کتاب کے متعدّد ایڈیشن شائع ہوئے لیکن ۱۹۱۲ء میں آریہ سماج لاہور کی طرف سے جو اُردو) مستند ایڈیشن شائع ہوا۔ اس میں سیکرٹری آریہ سماج کے قلم سے جو دیباچہ لکھا گیا ہے۔ اس میں تحریر ہے کہ:-

ستیارتھ پرکاش

اس لئے لازمی طور پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ ۱۸۷۵ء کا ستیارتھ پرکاش قطعی مستند ہے۔ اس لئے کہ یہ ستیارتھ پرکاش سوامی دیانند کی عین حیات میں مروّج تھا اور کہ انہوں نے اپنی زندگی میں ہی سدھانت وشیک اس کی اصلاح کردی تھی۔ اس کے

---

[1] اس سے یہ مراد نہیں کہ ان کتابوں میں کوئی ایک بات بھی درست نہیں۔ ان میں بھی کہیں کہیں نیکی اور سچائی کی تعلیم کے آثار مل جائیں گے۔ اس سے اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ یہ کسی زمانہ میں آسمانی تعلیم پر مشتمل تھیں، تو بھی یہ حقیقت اپنی جگہ باقی رہ جاتی ہے کہ جس شکل میں یہ کتابیں آج ہمارے سامنے موجود ہیں، وہ غیر محرّف آسمانی تعلیم کی شکل نہیں ہے۔ اس لئے اس ——— قسم کی محرف تعلیم انسانی زندگی کے لئے ضابطۂ عمل نہیں بن سکتی۔ دین کے متعلق حتمی اور یقینی طور پر معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا ایک ایک حرف منجانب اللہ ہے اور اس میں کہیں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہوئی۔ اس قسم کے دینی صحیفہ کی اطاعت، اطاعتِ خداوندی کہلا سکتی ہے نہ کہ محرف کتابوں کا اتباع۔

برعکس جو ستیارتھ پرکاش آجکل آریہ سماج میں مروج ہے، وہ کسی صورت میں بھی مستند نہیں مانا جاسکتا اس لئے کہ وہ سوامی دیانند کے مرنے کے بعد شائع ہوا ہے اور اس میں سوامی دیانند کے خیالات کو زیادہ تر دبایا اور قتل کیا گیا ہے۔ جیساکہ دونوں کے پہلو بہ پہلو مطالعہ کرنے سے ثابت ہوگا۔ میں سوامی دیانند کے اصل ستیارتھ پرکاش کو آریہ سماجیوں اور غیر آریہ سماجیوں کے ہاتھ میں دے کر التماس کرتا ہوں کہ وہ ستیہ کو گرہن کریں اور استیہ کو چھوڑ دیں۔ عقل مندوں کو اشارہ کافی ہے۔ زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔" (دھرمپال سیکرٹری آریہ سماج، لاہور)

پھر آخر میں لکھا ہے:-

"اس لئے میں صدقِ دل سے تمام آریہ سماجیوں اور پرتی ندھی سبھاؤں سے یہ پرارتھنا کرتا ہوں کہ وہ مروجہ نقلی ستیارتھ پرکاش کو، جو کہ سوامی دیانند کے مرنے کے بعد شائع کیا گیا ہے، ایک جگہ ڈھیر لگا کر جلا دیں۔ اور اصل ستیارتھ پرکاش مطبوعہ بنارس ۱۸۷۵ء کے سامنے، جو کہ سوامی دیانند کی حین حیات میں مروج تھا اور جس کا اُردو ایڈیشن میں ان کے سامنے پیش کرتا ہوں، سرِ تسلیم خم کریں تاکہ تمام جھگڑے فساد دُور ہو جائیں اور آریہ سماج کا دامن تمام دھبوں سے پاک ہو جائے کیونکہ اصل ستیارتھ پرکاش کی موجودگی میں اب نقلی ستیارتھ پرکاش کی ہرگز کوئی ضرورت نہیں۔ (دھرمپال، سیکرٹری آریہ سماج، لاہور)۔

آریوں پر بحث کرتے ہوئے ہم نے لکھا تھا کہ اب تحقیقاتِ جدیدہ کا رُخ کسی اور طرف بھی جا رہا ہے۔ مسٹر E. FORTON کا خیال ہے کہ آریہ دراصل سمیری قوم کے قبائل تھے جو کالڈیہ (بابل۔ میسوپٹومیا) میں رہتے تھے۔

آریوں کے متعلق جدید تحقیق

اور ۴۰۰۰ء اور ۳۰۰۰ء ق۔م کے قریب وہاں سے منتقل ہو کر سندھ اور جنوبی پنجاب کی طرف آئے۔ ڈراوڑی بھی وہیں کے قبائل میں سے تھے۔ دیکھئے 'LINKS WITH PAST AGES' ۔ اس باب میں بنارس ہندو یونیورسٹی کے ڈاکٹر پران ناتھ نے اپنی تحقیق کا نتیجہ ایک مسلسل مضمون کی صورت میں ۱۹۳۵ء میں ILLUSTRATED WEEKLY OF INDIA میں شائع کیا تھا جو اربابِ ذوق کے لئے بڑی دلچسپی کا مرکز رہا۔ اس میں انہوں نے بتایا تھا کہ "رگ وید" ہندوستانی کلچر سے بہت پہلے کی کتاب ہے اور دراصل سمیری قوم کے زمانہ سے متعلق ہے۔ سمیری

قوم شمالی ہندوستان سے لے کر مصر تک پھیلی ہوئی تھی اور ایشیائے کوچک، فینیشیا وغیرہ میں ان کی بڑی بڑی آبادیاں تھیں۔ سنسکرت زبان سمیری، شامی اور مصری زبانوں سے مرکب ہے۔ لہٰذا رگوید کسی پرانی سمیری تصنیف کا ترجمہ ہے اور برہمنوں کا تمام تمدن، شامی اور مصری تمدن ہی ہے۔ چنانچہ رگوید میں سمیری آبادیوں کے تمام بڑے بڑے شہروں کے نام موجود ہیں۔ لہٰذا ان لڑائیوں کے حالات بھی مذکور ہیں جو آریوں اور فارس اور بابل کی سامی اقوام کے درمیان ہوئیں۔

چنانچہ ڈاکٹر صاحب کا خیال ہے کہ "رگوید کا قریب پانچواں حصہ نیل کی وادیوں سے آیا ہوا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ کے مصری ہی آریہ تھے۔" اس کے بعد وہ رگوید کی زبان پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "سیانے پنڈتوں نے جب رگوید کا ترجمہ کیا تو یہ ترجمہ غلط تھا۔ اس لئے کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ رگوید کوئی ہندوستانی صحیفہ ہے۔ اس لئے اس میں جو مصری اور سمیری الفاظ تھے۔ ان کا ترجمہ بھی سنسکرت کی گرامر کی رو سے کیا گیا۔ اس طرح آریوں کی تاریخ یکسر غلط شاہراہ پر جا پڑی۔" اپنے مضمون کی آخری کڑی میں ڈاکٹر موصوف نے بتایا ہے کہ کس طرح ہندومت کے ماخذ مصری اور بابلی عقائد و نظریات ہیں۔

اس سے بعض لوگوں کا خیال اس طرف بھی گیا ہے کہ آریہ، دراصل بنی اسرائیل کے گم گشتہ قبائل میں سے ہیں۔ ہم داستانِ بنی اسرائیل میں بتا چکے ہیں کہ جب بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کیا تو یہودیوں کو غلام بنا کر اپنے ساتھ (بابل) لے گیا تھا۔ یہ وہاں قریب ستر برس تک رہے لیکن بڑی ابتری اور پریشانی کی حالت میں۔ جب بیت المقدس کی از سر نو تعمیر ہوئی تو ان بارہ قبائل میں سے صرف دو اہم قبیلے واپس آکر متمکن ہوئے۔ باقی دس قبائل اِدھر اُدھر منتشر ہو چکے تھے۔ ان قبائل کو تاریخ "گم گشتہ" قبائل قرار دیتی ہے کیونکہ آج تک یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ قبائل کہاں گئے۔ بعض ان کا سراغ شمالی امریکہ کے اصلی باشندوں اور میکسیکو تک لگاتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ افغانستان اور سرحد کے پٹھان، یہی گم گشتہ قبائل ہیں لیکن اب تحقیق کا رُخ اس طرف آ رہا ہے کہ یہ گم گشتہ قبائل ہندوستان کے آریہ ہیں۔ چنانچہ ان دونوں میں بہت سی ذہنی، نفسیاتی، معاشرتی اور مذہبی مماثلت اور مشارکت پائی جاتی ہے۔ (حتیٰ کہ حضرت موسیٰؑ اور فرعون کے واقعہ اور کرشن جی اور کنس کے قصہ کی جزئیات تک مشترک دکھائی دیتی ہیں) چنانچہ مشہور صوفی شیخ عبدالکریم جیلی نے اپنی کتاب "الانسان الکامل" (حصہ دوم باب ۶۳) میں لکھا ہے کہ "ہندوستان کے برہمن، جو حضرت ابراہیمؑ[1] کی اولاد میں سے ہیں اور اپنے قدیم آبائی مذہب سے برگشتہ ہو گئے ہیں۔"

---

[1] برہمن اپنے آپ کو برہما کی اولاد کہتے ہیں اور ان محققین کا خیال ہے کہ برہما دراصل براہیم (حضرت ابراہیمؑ) ہی ہیں۔

بہرحال یہ سب تاریخی قیاسات ہیں۔ نہ ابھی یقینی طور پر — یہ معلوم ہو سکا ہے کہ آریہ قوم کا اصلی وطن کون سا تھا اور نہ ہی یہ کہ ہندومت کہاں سے چلا اور کیا کیا بنتا رہا۔

آگے بڑھنے سے پہلے، ہم اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر دُہرا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ مذاہبِ عالم کی کتبِ مقدسہ اور ان کی تعلیم کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے (یا جو کچھ ابھی اور لکھا جائے گا) اس سے مقصود صرف تبیانِ حقیقت ہے، کسی کی تنقیص و تحقیر یا دلآزاری مطلوب نہیں۔ اس لئے ہم نے اس باب میں خاص احتیاط ملحوظ رکھی ہے کہ ان کتابوں یا ان کی تعلیم کے متعلق اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہ لکھا جائے اور جو کچھ پیش کیا جائے، انہی مذاہب کی کتابوں سے اور انہی کے مشاہیر کی سند سے پیش کیا جائے۔ ان مذاہب کے بانیوں کی عزت ہمارے دل میں ہے۔ اس لئے ان کی شان میں کسی قسم کی گستاخی کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ بتانا صرف یہ مطلوب ہے کہ جو تعلیم آج ان کی طرف منسوب کی جاتی ہے، (وہ تعلیم خود اس پر شاہد ہے کہ) وہ ان کی طرف سے پیش کردہ اصلی تعلیم نہیں بلکہ اس میں بہت کچھ آمیزش ہو چکی ہے اور یہ بتانے کے لئے اس کے سوا کوئی اور طریق نہیں کہ اس تعلیم کو بلاکم و کاست سامنے رکھ دیا جائے تاکہ ہر شخص از خود صحیح نتیجہ تک پہنچ سکے۔

باب پنجم

اہلِ چین کے مذاہب

—— ۵ ——

تہذیب و تمدن کے اعتبار سے چین دنیا کے قدیم ترین ممالک میں شمار کیا جاتا ہے، اس لئے بظاہر انسان اسی نتیجہ پر پہنچتا ہے کہ مذہبی اعتبار سے بھی اسے ایسی ہی اہمیت حاصل ہونی چاہیئے لیکن تحقیق کے بعد نتیجہ اس کے برعکس مرتّب ہوتا ہے۔ چین میں تین مذاہب مروّج ہیں۔

۱۔ بدھ مت،

۲۔ کنفیوشس ازم،

۳۔ طاؤ ازم۔

بدھ مت کے متعلق ہم سابقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ آج اس کی اصلیت کیا باقی رہ گئی ہے۔ باقی دو میں سے کنفیوشس ازم بہت اہم ہے لیکن اس مذہب کا خود ہی یہ دعویٰ نہیں کہ اس کی تعلیم وحی یا الہام پر مبنی ہے۔ باقی رہا طاؤ ازم، سو وہ ایک فلسفیانہ مسلک ہے جو مذہب کے تحت بمشکل آسکتا ہے۔ بایں ہمہ چونکہ یہ دونوں "مذہب" بہت قدیم ہیں۔ اس لئے ان کا اجمالی تعارف بھی ضروری سمجھا گیا ہے —— پہلے کنفیوشس ازم کو لیجئے۔ پروفیسر میکس مُلر نے "مشرق کی کتب مقدسہ" کو سلسلہ وار شائع کیا تھا۔ اس سلسلہ میں کنفیوشس کی کتابوں کا ترجمہ LEGGE نے کیا۔ یہ مستشرق اپنے ترجمہ کی تمہید میں لکھتا ہے:۔

"چین کا سب سے بڑا مذہب کنفیوشس ازم ہے اور اس کا انتساب اس مردِ پارسا کی طرف ہے جو پانچویں چھٹی صدی (ق۔م) میں گزرا ہے۔ درحقیقت کنفیوشس اس مذہب کا بانی نہیں، نہ ہی وہ پہلا شخص ہے۔ جس نے اس کے احکام نافذ کئے یا عبادات وغیرہ کے رسوم کی ترویج کی۔ اس نے اپنے متعلق خود کہا ہے کہ "میں (اسلاف کا سرمایہ) آگے منتقل کرنے والا ہوں خود

کچھ بنانے والا نہیں ہوں ۔ مجھے اسلاف سے محبت بھی ہے اور عقیدت بھی۔"
اسی بنا پر کتاب DOCTRINE OF MEANS میں جو کنفیوشس کے پوتے کی طرف منسوب ہے۔ لکھا ہے کہ :۔

کنفیوشس نے YAO اور SHUN کے اصولوں کی ترویج کی۔ گویا وہ اس کے اسلاف تھے، اور WON اور WU کے احکام کو نافذ کیا، جنہیں اس نے اپنے سامنے بطور نمونہ رکھا۔ .... یہ سمجھنا بھی غلطی ہے کہ ان کتابوں میں سے، جو اس کے زمانہ میں مروج تھیں، اس نے کتب تاریخ، منظوم صحائف یا اسی قسم کی دوسری پرانی کتابوں کو تالیف کیا تھا۔ اس وقت عہدِ کہن کی کتابوں کا کچھ حصّہ تو ضائع ہو چکا تھا۔ جو کچھ باقی تھا، اس کا اس نے مطالعہ کیا اور اپنے شاگردوں کو اس کی ترغیب دلائی۔ اس طرح وہ حصّہ محفوظ ہو گیا........ افسوس ہے کہ کنفیوشس کے بعد ان پرانی کتابوں کا بہت سا حصّہ ضائع ہو گیا یا مجروح ..... لیکن قارئین کو یہ اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے کہ چین کی یہ پرانی کتابیں اس امر کی مدعی نہیں کہ وہ الہامی ہیں یا بذریعہ وحی نازل ہوئی ہیں۔ انہیں مؤرخین، شعراء اور دیگر مصنّفین نے اسی طرح تصنیف کیا، جس طرح یہ باتیں ان کے خیال میں آئیں۔

اس تمہیدی تعارف سے یہ حقیقت سامنے آ گئی کہ :۔

۱۔ کنفیوشس ازم کے بانی جناب کنفیوشس نہیں تھے بلکہ انہوں نے اپنے وقت کے مروجہ عقائد و رسوم کی ترویج و تنقید کی اور ان ہی کو آگے منتقل کیا۔

۲۔ جناب کنفیوشس کے زمانہ میں بھی اس مذہب کی پرانی کتابیں بہ تمام و کمال موجود نہ تھیں۔

۳۔ جناب کنفیوشس کے بعد ان کتابوں کا اور حصّہ بھی ضائع ہو گیا۔

۴۔ اور اس مذہب نے اپنے الہامی ہونے کا دعویٰ ہی نہیں کیا۔

لٹریچر

لہٰذا کنفیوشس ازم نہ تو الہامی مذہب ہونے کا مدعی ہے اور نہ ہی ان کے ہاں ایسا لٹریچر ہے۔ جس کے متعلق وہ یقینی طور پر کہہ سکیں کہ وہ اسی میں ہے، جس شکل میں اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ اس باب میں JOSEPH EDKINS اپنی کتاب RELIGION IN CHINA میں لکھتا ہے کہ :۔

"اہلِ چین کے ہاں ایسا لٹریچر موجود نہیں، جسے بطور سند پیش کر سکیں، جس طرح ہم عیسائیوں کے ہاں ہے۔" (صفحہ ۱۶۴)

عیسائیوں کے ہاں جس قسم کا "مستند" مذہبی لٹریچر موجود ہے۔ اس کا جائزہ ہم "عیسائیت" کے عنوان میں لے چکے ہیں۔ سو جب اہلِ چین کے ہاں ایسا مستند لٹریچر بھی نہیں، جیسا عیسائیوں کے ہاں ہے تو اس سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ اہلِ چین کا لٹریچر کس قدر قابلِ اعتماد قرار دیا جا سکتا ہے؟

اہم کتابیں

اس مذہب کی اہم کتابیں حسب ذیل ہیں:۔

(۱) SHUKING ایک تاریخی کتاب ہے۔ جس میں ۲۴۰۰ سنہ ق۔م سے لے کر ۶۱۹ سنہ ق۔م تک کے مختلف شاہی خاندانوں کے حالات مذکور ہیں۔

۲۔ 'SHINKING' منظوم کتاب ہے۔ جس میں ۱۷۶۶ سنہ ق۔م سے لے کر ۵۸۶ سنہ ق۔م تک کے خاندانوں کے منظوم حالات ہیں۔ SZEMAKHIEN اپنے MEMOIRS OF CONFUCIOUS میں لکھتا ہے کہ شروع میں ان نظموں کی تعداد قریب (۳۰۰۰) تھی۔ کنفیوشس نے ان میں سے (۳۰۵) کا انتخاب کیا اور یہی منتخب حصہ آگے منتقل ہوا۔ اصلی نظموں کے متعلق KUHST ۱۱۷۸ سنہ ء میں لکھتا ہے کہ "جب شاہی انتظام کا خاتمہ ہو گیا تو ان نظموں کی جمع و تدوین کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔ جو نظمیں ادھر ادھر فضا میں منتشر ہوئیں، ان میں بہت سی غلطیاں تھیں۔ کنفیوشس نے ان ہی منتشر نظموں کو جمع کیا اور ان کی تصحیح کے کے بعد ان کا انتخاب کیا۔ یہ نظمیں کس قسم کی ہیں؟ اس کا اندازہ پہلی نظم کے پہلے بند سے لگائیے۔ جس میں لکھا ہے:۔

"کس قدر قابلِ تعریف اور مکمل ہیں ہمارے ڈھول، جو ہم آہنگ بھی ہیں اور بلند بانگ بھی تاکہ ہمارے قابلِ فخر اسلاف ان کی آواز سے خوش ہوں۔"

۳۔ 'YI' یعنی کتابِ تغیرات۔ یہ وقائع و حوادث کی سب سے پرانی کتاب قرار دی جاتی ہے۔ جس کا سنِ تالیف ۱۱۴۳ سنہ ق۔م کہا جاتا ہے۔ مؤلف کا نام KING WAN تھا۔ کنفیوشس نے کہا تھا کہ "اگر میری زندگی میں کچھ برس کا اضافہ ہو جائے تو میں پچاس برس 'YI' کے مطالعہ کے لئے وقف کر دوں اور اس کے بعد بڑی بڑی غلطیوں سے بچ جاؤں گا۔" (ANALECTS VII) اس قدر اہم کتاب میں ہے کیا؟ جفر کے نقشے بنا کر فالنامے دیے گئے ہیں مثلاً

یہ نقشہ 'LIN' کا مرتّب کردہ ہے۔ جس کے بیان کے مطابق اس نقشے کے صحیح نکلنے کی صورت میں بڑی ترقی اور کامیابی ہوگی۔ آٹھویں مہینہ میں البتہ خطرہ نظر آتا ہے۔

ساری کتاب اسی قسم کے جوتش کے نقشوں پر مشتمل ہے۔

۴۔ 'LI KI' رسومات کی کتاب ہے۔ یہ درحقیقت 'KAN' خاندان کی سرکاری کتاب تھی۔ جس میں ان رسومات و مناسک کی تفاصیل درج ہیں۔ جنہیں بادشاہ اور دیگر امراء ادا کیا کرتے تھے۔

۵۔ 'KHUN KHIU' یا "بہارِ خزاں" کنفیوشسس کی اپنی تالیف ہے۔ جس میں اس نے سلطنتِ L.U. کے (۷۲۲ سے ۴۸۱ ق۔م تک کے) حالات لکھے ہیں۔

۶۔ ان کے علاوہ کنفیوشسس کا ایک مختصر سا رسالہ HSIAO KING ہے، جس میں والدین کے حقوق و فرائض کا تذکرہ ہے۔ اس کتاب کو بہت وقیع سمجھا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کنفیوشسس ازم کی بنیادی تعلیم والدین کی اطاعت (بلکہ پرستش) ہے۔ اور صرف والدین ہی کی نہیں بلکہ تمام اسلاف کی پرستش، ہر اسلاف پرست قوم کی طرح، ان کے ہاں بھی یہ عقیدہ ہے کہ KIN PUH JOO KOO یعنی "موجودہ زمانے کے لوگوں کا زمانۂ سلف کے لوگوں سے کیا مقابلہ؟" وہی تعلیم جس سے اسلاف پرست اقوام کو اپنا ماضی درخشندہ اور مستقبل ہمیشہ تاریک نظر آیا کرتا ہے۔

مذکورہ بالا کتابوں کے علاوہ ذیل کی چار کتابوں کو بھی مقدّس تسلیم کیا جاتا ہے۔ پہلی کتاب LUN YU کنفیوشسس کے مکالمات و مباحثات پر مشتمل ہے۔ دوسری کتاب MENCIUS ہے جو کنفیوشسس کے بعد اس مسلک کا سب سے بڑا فلاسفر گزرا ہے۔ تیسری کتاب کا نام TAHSIO ہے جو ایک اور فلاسفر TANTG TZE کی تصنیف ہے اور چوتھی کا نام KUNG YUNG یا 'DOCTRINE OF MEANS' ہے۔ جو کنفیوشسس کے پوتے کی طرف منسوب ہے۔

تعلیم

اس میں شبہ نہیں کہ یہ مذہب عام اخلاقیات میں عمل پر بڑا زور دیتا ہے لیکن عقائد تمام تر توہم پرستی پر مبنی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں آسمان کی پرستش اور اس کے ساتھ چھوٹے چھوٹے دیوی دیوتاؤں کی پرستش ہوتی ہے اور مندروں میں کنفیوشسس کے نام پر

قربانیاں دی جاتی ہیں

کمیونزم | ۱۹۴۹ء میں چین میں کمیونزم کا اقتدار قائم ہوگیا اور چونکہ یہ فلسفۂ زندگی کسی قسم کے مذہب کو تسلیم ہی نہیں کرتا، اس لئے اس نے اپنے قدیم مذہب کو یکسر دریا بُرد کر دیا۔ لہٰذا ہم نے جو کچھ اہلِ چین کے مذہب کے متعلق لکھا ہے، اسے اب داستانِ پارینہ سمجھنا چاہیئے۔ مذہب، یعنی انسانوں کے خودساختہ معتقدات و رسومات کا انجام ایسا ہی ہوتا ہے، کسی کا ذرا پہلے، کسی کا بعد۔ ان میں باقی رہنے کی صلاحیت ہی نہیں ہوتی۔ (باقی صرف خدا کا دیا ہوا، غیر محرّف دین رہ سکتا ہے۔)

طاؤازم

(۲)

اب 'TAOISM' کی طرف آیئے۔ یہ عام طور پر LOOTZE کی طرف منسوب کیا جاتا ہے جو ۶۰۴ قبل مسیح میں پیدا ہوا (لیکن تحقیقاتِ جدیدہ سے ثابت ہوا ہے کہ اس مذہب یا صحیح الفاظ میں فلسفیانہ مسلک کا بانی LOOTZE نہیں بلکہ یہ مسلک اس سے بہت پہلے موجود تھا۔ یہ کنفیوشس سے پچاس سال بڑا تھا اور LOOTZE کا نام کنفیوشس کا ہی دیا ہوا ہے۔ جس کے معنی "بوڑھا فلسفی" ہیں — یہ خاندان KAO میں لائبریرین تھا۔ اس خاندان کے انحطاط سے یہ دل برداشتہ ہوگیا اور اس نے دنیا تیاگ دینے کا فیصلہ کر لیا۔ جب شہر چھوڑ کر باہر جانے لگا تو داروغہ نے اسے روک لیا اور کہا کہ مجھے کچھ لکھ کر دیتے جاؤ۔ چنانچہ اس نے TAOTEHKING کتاب لکھ کر اسے دی جو اس مسلک کی مقدس کتاب سمجھی جاتی ہے۔ یہ کتاب بہت مختصر سی ہے۔ اس کتاب میں خدا TAO کا نام صرف ایک جگہ آیا ہے۔ جہاں LAO، TAO کے متعلق لکھتا ہے:۔

"میں نہیں جانتا کہ TAO کس کا بیٹا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ شاید خدا سے بھی پہلے موجود تھا۔"

اس مسلک میں طاؤ TAO کو بڑی نمایاں پوزیشن حاصل ہے لیکن ان کتابوں سے کچھ متعین نہیں ہو سکتا کہ TAO ہے کیا؟ یہ تو اوپر لکھا جا چکا ہے کہ خود LAO کے عقیدہ کے مطابق یہ TAO معاذاللہ خدا سے بھی پہلے موجود تھا!

LAO کے بعد اس مسلک کا سب سے بڑا مبلّغ KWANGTZE گزرا ہے جو چوتھی صدی ق۔م میں پیدا ہوا۔ اس کی کتابیں تاریخ پر مشتمل ہیں لیکن LEGGE کی تحقیق کے مطابق (جس نے ان کتابوں کا بھی ترجمہ کیا ہے):۔ "اس کے پاس تاریخ کی سند کوئی نہیں ہوتی۔" TAO کے متعلق KWANG اپنی چوتھی کتاب میں لکھتا ہے:۔

آؤ میں تمہیں بتاؤں کہ مکمل TAO کیا ہوتا ہے؟ اس کا جوہر یکسر تاریکی میں ملفوف ہے۔ اس کی انتہائی بلندی، خاموشی اور عظمت میں ہے۔ وہاں نہ کچھ سننا ہے نہ دیکھنا۔ جب تمہاری آنکھیں کچھ

نہ دیکھیں، تمہارے کان کچھ نہ سنیں اور تمہارا دل کچھ نہ سمجھے تو (ایسی حالت میں) تمہاری روح تمہارے جسم کو سنبھال لے گی اور جسم بہت زیادہ عرصہ تک زندہ رہے گا۔ جو تمہارے اندر ہے، اس پر نگاہ رکھیئے اور جو ذرائع تمہیں باہر کی دنیا سے وابستہ رکھتے ہیں، انہیں منقطع کر دیجئے۔ زیادہ علم خطرناک ہوتا ہے۔ میں ۱۲۰۰ سال سے اسی انداز سے زندگی بسر کر رہا ہوں اور اس پر بھی میرا جسم ابھی تک رو بہ انحطاط نہیں۔"

اس سے ظاہر ہے کہ طاؤازم TAOISM باطنیت (یوگ کے گیان دھان) کی شکل کی ریاضتوں کا نام تھا، اور اس حالت کا مظاہرہ تھا، جس میں انسان خارجی دنیا سے قطع علائق کر کے صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ ہو جائے اور اس کا نام عالمِ بالا کی کیفیات رکھ لے۔ نیز اس میں پرانایم (حبسِ دم) کی مشق سے "زیادہ عرصہ تک زندہ رہنے کی بھی کوشش کی جاتی تھی" بلکہ اس مسلک کا منتہائے نگاہ یہی تھا۔ چونکہ اس کا تعلق گیان دھیان کے "فلسفہ" سے تھا، اس لئے ان کتابوں میں اس قسم کی مجذوبانہ باتیں بھی ملتی ہیں، جن کا کچھ مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔ مثلاً یہ کہ طاؤ TAO کچھ نہیں کرتا اور اس کے لئے کوئی کام ایسا نہیں، جسے وہ نہیں کرتا۔"

بہترین دَور ماضی پرستی ان کے ہاں بھی کنفیوشس ازم سے کچھ کم نہ تھی۔ چنانچہ KWANG لکھتا ہے کہ زمانہ قدیم میں جب دنیا پر TAO کی حکومت تھی تو یہ دنیا جنت تھی۔ جس کا نقشہ کچھ اس قسم کا تھا کہ:-

"لوگ عقل کو کچھ اہمیت نہیں دیتے تھے اور دانشمند لوگوں کو کوئی پوچھتا نہیں تھا۔ خوراک سادہ، لباس سادہ، طور طریق سادے، لوگ ایک دوسرے کے قریب رہتے تھے لیکن بایں ہمہ تمام عمر ایک دوسرے سے ملتے نہیں تھے۔ یہ تھا وہ زمانہ، جب نیکی کا دور دورہ تھا....... جب لوگوں نے علم کی تحصیل شروع کر دی تو پھر یہ دَور ختم ہو گیا۔"

اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس مسلک کی رُو سے انسانی زندگی کا منتہائے کمال کیا ہے؟ علم و دانش سے اس قدر نفرت کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ مسلک یکسر جہالت و توہم پرستی کا مجموعہ بن چکا ہے۔ ان کا عقیدہ یہ ہے کہ TAOISM موروثی طور پر KWANG خاندان میں چلی آرہی ہے۔ اس خاندان کے کسی بچہ میں TAO کی روح حلول کر آتی ہے اور اس کے بعد معجزانہ طور پر اس کی جانشینی کا علم ہو جاتا ہے۔

بُت پرستی ان کے ہاں تین مجسموں کی پرستش خاص طور پر ہوتی ہے۔ جنہیں SHANG TI

کہا جاتا ہے۔ پہلا مجسمہ، تخریب کے دیوتا کا ہے۔ دوسرا 'LAOTZE' کا اور تیسرے کے متعلق ابھی یقینی طور پر متحقق نہیں کہ کس کا ہے۔ غالباً TAO کا۔ ان کے علاوہ ان کے مندروں میں دوسرے دیوی دیوتاؤں کے بتوں کی پرستش بھی ہوتی ہے، ستاروں اور جنات کی بھی۔ انہی چیزوں کے پیشِ نظر 'MR: EDKINS' اس مذہب کے متعلق لکھتا ہے:

"عام عقائد کے مطابق طاؤازم دنیا کے مذاہب میں سب سے زیادہ نفرت انگیز مذہب ہے۔"

(RELIGION OF CHINA. P.63)

اور LEGGE لکھتا ہے کہ:-

"خدا کے متعلق اس قسم کی لاادریت اور ان کے اس عقیدہ کے بعد کہ سانس کو ایک طریق سے ضبط کر لینے سے زندگی کو غیر محدود طور پر بڑھایا جا سکتا ہے، میں نہیں سمجھتا کہ قدیم طاؤازم کو کس طرح ایک مذہب تصور کیا جا سکتا ہے۔"

یہ ہے مختصراً چین کے مذاہب کی کیفیت۔ اس لئے ان کے متعلق یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ یہ نوعِ انسانی کے لئے ضابطۂ زندگی بننے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتے تھے۔

اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ چین میں اشتراکیت اس شدت اور تیزی سے کیسے پھیل گئی۔ چین کے باشندے یا تو بدھ مت کے پیرو تھے اور یا کنفیوشس ازم کے اور طاؤازم کے پرستار۔ ان مذاہب میں توہم پرستی، عقل دشمنی، علم سے نفرت، دنیا سے حقارت، اسلاف پرستی جس حد تک پہنچ چکی تھی، وہ ایک شدید ردِ عمل کی متقاضی تھی۔ یہی ردّ عمل، اشتراکیت کی شکل میں رُونما ہؤا۔ جس میں خدا، وحی، رسول، آخرت، ہر چیز کا انکار ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جس جس قوم میں بھی اس قسم کے معتقدات پائے جائیں گے، وہاں زُود یا بدیر دہریت جگہ پکڑ جائے گی۔ یہ دہریت یا تو کھلی ہوئی اشتراکیت کی صورت میں سامنے آئے گی یا قومی سیکولرازم کی شکل میں۔ دنیا میں اس وقت ہر جگہ یہی ہو رہا ہے۔ لیکن دہریت، بہرحال غلط مذہب سے بہتر ہوتی ہے کیونکہ غلط مذہب میں نہ انسان کے سامنے وحی کی قندیل ہوتی ہے نہ عقل کی شمع۔ دہریت میں انسان کم از کم عقل کی روشنی میں تو چلتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس ملک نے غلط مذہب سے چھٹکارا حاصل کیا ہے، وہاں زندگی کے آثار نمودار ہو گئے ہیں۔ لیکن حقیقی زندگی تو دین کے اتباع سے مل سکتی ہے۔

باب ششم

اہلِ جاپان کا مذہب

شنٹو ازم (٦)

زمانۂ قبل از تاریخ میں جاپان پر جو قبیلہ حکمران تھا، وہ سورج کی دیوی کی پرستش کرتا تھا بلکہ یوں سمجھئے کہ سورج کی دیوی ان کی پرستش کا مرکز تھی، جس کے گرد ہزارہا دیوی دیوتا اور بھی تھے۔ ان کے علاوہ، ان کے اسلاف کی بھی پرستش ہوتی تھی۔ اس نے آگے چل کر ایک مذہب کی شکل اختیار کر لی، جسے شنٹو ازم (یعنی دیوتاؤں کا راستہ) کہا جاتا ہے۔ اب جاپان میں یہ مسلک مذہب ہی کی حیثیت نہیں بلکہ ان کے قومی تمدن کی بھی حیثیت اختیار کئے ہوئے ہے۔ اس لئے کہ اس کا محور شاہنشاہِ جاپان کی پرستش ہے۔ اہلِ جاپان کے ہاں روایت ہے کہ سورج کی دیوی نے اپنے پوتے (یعنی جاپان کے سب سے پہلے شاہنشاہ) کو آسمانی تحائف (تلوار، آئینہ اور جواہر پارہ) دیے تھے جو اس سلسلۂ خاندان میں محفوظ چلے آرہے ہیں۔

چھٹی صدی عیسوی میں جب بدھ مت جاپان میں آیا تو اس نے وہاں کے شنٹو ازم کو بھی متاثر کیا۔ اس سے ایک امتزاجی مذہب پیدا ہوا ہے۔ جسے RYO - BU-SHINTO (یعنی دوطرفہ شنٹو) کہتے ہیں لیکن جب ۱۸٦۸ء میں جاپان میں قومی انقلاب ہوا تو انہوں نے پھر سے اپنے قدیمی مذہب (شنٹو ازم) کو ان خارجی اثرات سے منزہ کرنے کی کوشش کی۔

پانچویں صدی عیسوی سے قبل جاپان میں تحریر کا رواج نہ تھا۔ اس لئے شنٹو ازم زبانی روایات پر مشتمل تھا، جو ملک میں ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھیں۔ (آٹھویں صدی میں ان روایات کو یکجا کر کے دو کتابیں 'KOJIKI' اور NIHONGI مرتب کی گئیں) ان کے ہاں خدا کے لئے لفظ KAMI ہے لیکن ان کتابوں میں ان تمام چیزوں کو KAMI کہا گیا ہے، جن کی ان کے ہاں پرستش ہوتی ہے۔ خود شہنشاہ تمام اسلاف، پرندے، حیوانات درخت، پودے، سمندر، پہاڑ، بھیڑیا، شیر، لومڑی سب KAMI ہیں۔ حیات بعد الممات کا ان کے ہاں کوئی تصور

نہیں ۔ تخلیق کائنات کے متعلق ان کے ہاں روائیت ہے کہ آسمان کے تیرتے ہوئے پل پر ایک جوڑا رہا کرتا تھا۔ نر کا نام 'IZONGI' اور مادہ کا 'IZONAMI' تھا۔ وہ جوڑا زمین کے ایک جزیرے پر اُترا اور وہاں انہوں نے ایک مکان بنایا۔ جس میں ایک بہت بڑا ستون تھا۔ وہ دونوں اس ستون کے گرد گھومے اور جب ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہوا تو پہلے مادہ بولی، اس سے نر کو بہت غصّہ آیا اور اس نے دوبارہ گھومنے کے لئے کہا۔ جب پھر آمنے سامنے آئے تو پہلے نر بولا اور اس نے مادہ سے کہا کہ تو کس قدر خوبصورت ہے۔ اس سے دونوں میں میاں بیوی کے تعلقات پیدا ہو گئے۔ اس تعلق کے نتیجہ سے جاپان کے مختلف جزیرے اور بہت سے دیوی دیوتا وجود میں آئے۔ اس جوڑے سے آگ کی دیوی کی پیدائش کے وقت IZONAMI کی وفات ہوگئی۔ اس پر نر کو غصّہ آیا، اور اس نے اس نومولود (آگ کی دیوی) کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ جس سے اور بہت سے دیوی دیوتا نمودار ہو گئے۔ اب یہ نر، اپنی بیوی کے پیچھے "مردوں کی سرزمین" YOMI میں گیا۔ وہاں سے واپسی پر ایک سمندر میں غوطہ لگایا تو اس کی پلکوں سے پانی کے جو قطرے ٹپکے، اس سے سورج پیدا ہوا اور ناک کے قطروں سے چاند۔ وقس علیٰ ھٰذا۔ دونوں مذہبی کتابیں اسی قسم کی روایات پر مشتمل ہیں۔ ان کتابوں میں اخلاق کے متعلّق کوئی تعلیم نہیں۔ مندروں میں کنواری لڑکیاں پروہت بنا کر رکھی جاتی ہیں۔ جب ان پر غشی (ہسٹیریا) کے دورے پڑتے ہیں تو اس وقت وہ جو کچھ بولتی ہیں، انہیں الہامی سمجھا جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ جادو کا بھی بہت زور ہے۔

یہ ہے جاپان کا مذہب شنٹوازم۔ جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے، اس مذہب کا مرکزی تصوّر اپنے بادشاہ کی پرستش ہے۔ بادشاہ انسان نہیں بلکہ خدا سمجھا جاتا ہے۔ جاپانی اپنے اس عقیدہ میں اس درجہ متشدّد ہیں کہ وہ اپنے بادشاہ (خدا) کے لئے بلا تأمل جان دے دینا ایک کھیل سمجھتے ہیں لیکن گزشتہ عالمگیر جنگ ۱۹۳۸ء ـ ۴۵ میں اہلِ جاپان کو جو شکست ہوئی اور اس کے بعد ان کے ملک کا نظم و نسق اہلِ مغرب کے ہاتھ میں آیا تو اس سے ان کا بادشاہ "مقامِ خداوندی" سے خود بخود نیچے اُتر کر عام انسانی سطح پر آ گیا۔ ؎

بیک گردشِ چرخِ نیلوفری
نہ انجن بماند نہ انجنیری

نگہِ بازگشت

گذشتہ صفحات میں جو کچھ آپ کی نظروں سے گزرا ہے، اس سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اس وقت دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے پاس جو کتابیں ہیں، ان میں سے کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں جس کے متعلق خود ان مذاہب کے متبعین کا یہ دعویٰ ہو کہ وہ اپنی اصلی اور غیر محرّف شکل میں وہی ہیں جو اُن کے مذہب کے بانی نے انہیں دی تھیں۔ یہ سب کتابیں، انسانی تحریفات کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہیں۔ لہٰذا ان کتابوں کے مطابق عمل کرنے سے کوئی شخص بھی اس کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ خدا کی دی ہوئی راہ نمائی کا اتباع کرتا ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ اگر دنیا کے مختلف مذاہب کے پیرو اپنے اپنے مذہب کی کتابوں پر کاربند ہو جائیں، تو ان کے متعلق تسلیم کیا جائے گا کہ وہ سچائی کے راستے پر ہیں، حقیقت سے انکار ہے۔ جب کسی اہلِ مذہب کے پاس، خدا کی تعلیم اس کی منزّہ شکل میں موجود ہی نہیں، تو ان کے لئے خدا کی دی ہوئی تعلیم پر کاربند ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اب ان کتابوں کی اصلی اور سچّی تعلیم قرآنِ کریم کے اندر ہے، جو اس خدا کی طرف سے نازل ہوا تھا، جس نے ان سابقہ کتابوں کو بھیجا تھا۔ لہٰذا اب تعلیمِ خداوندی پر کاربند ہونے کی شکل ایک ہی ہے، یعنی قرآنِ کریم کی اطاعت۔

قرآنِ کریم جو اس وقت دنیا میں موجود ہے، وہ حرفاً حرفاً وہی ہے جسے اللہ تعالےٰ نے حضور نبی اکرمؐ پر نازل کیا تھا۔ اس حقیقت پر خود غیر مسلم مفکرین اور مؤرّخین کی شہادات موجود ہیں۔ یہ حقیقت آپ کے سامنے آئندہ باب میں آئے گی۔

باب ہفتم

قرآنِ مجید

(خُدا کی آخری، مکمل اور غیر محرّف کتاب)

جیساکہ شروع میں لکھا جاچکا ہے، اللہ تعالےٰ نے انسانی ہدایت کے لیئے حضرات انبیاء کرامؑ کو بھیجا۔ یہ نبیؐ دنیا کی ہر قوم میں اور ہر زمانے میں آتے رہے۔ نبیؐ کو جو تعلیم وحی کے ذریعے سے ملتی تھی، وہ اس کی کتاب کہلاتی تھی۔ جہاں تک اس تعلیم کے اصولوں کا تعلق تھا، یہ شروع سے اخیر تک ایک ہی چلے آرہے تھے لیکن ان اصولوں کی روشنی میں جو احکام دیے جاتے تھے، وہ اس قوم کی حالت کے مطابق ہوتے تھے، جس قوم کی طرف وہ نبیؐ آتا تھا۔ وہ نبیؐ، اپنی قوم تک خدا کے پیغامات پہنچاتا، ان پر عمل کر کے دکھاتا اور پھر اپنے وقت پر دنیا سے چلا جاتا لیکن اس کے بعد، وہ قوم اس کتاب میں ردوبدل شروع کر دیتی۔ بعض اوقات وہ کسی خارجی حادثہ کی وجہ سے ضائع ہی ہوجاتی۔ اس کے بعد ایک اور نبیؐ آجاتا۔ وہ پھر آسمانی تعلیم کو اس قوم تک پہنچاتا۔ اس کی تعلیم اصولی طور پر وہی ہوتی جو سابقہ نبیؐ کی تھی لیکن اگر زمانے کے تقاضے کے مطابق سابقہ نبیؐ کی تعلیم کے احکام میں سے کسی میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہوتی تو اس کی جگہ تبدیل شدہ حکم دے دیا جاتا۔ یہ اس نئے نبیؐ کی کتاب کہلاتی۔ یہ سلسلہ دنیا کی ہر قوم میں، اور ہر زمانے میں جاری رہا۔ سابقہ صفحات میں ہم نے ان کتابوں کا ذکر کیا ہے، جنہیں دنیا کی مختلف قومیں اپنی آسمانی کتابیں کہہ کر پیش کرتی ہیں۔ ان کتابوں کی تاریخ سے ہم نے دیکھ لیا کہ ان کتابوں میں سے کوئی کتاب بھی دنیا میں اپنی شکل میں موجود نہیں، یعنی اس شکل میں موجود نہیں، جس میں ان کے نبیؐ نے انہیں دیا تھا۔

نزولِ قرآن کے وقت

ان کتابوں کی حالت آج ہی ایسی نہیں ہوئی، چھٹی صدی عیسوی میں ان کی حالت ایسی ہی ہوچکی تھی۔ یعنی اُس وقت دنیا کی کسی قوم کی پاس، آسمانی کتاب، اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں تھی۔ بالفاظِ دیگر اس وقت وحی کی تعلیم دنیا میں کہیں بھی اپنی خالص، منزّہ شکل میں باقی نہیں رہی تھی۔ اس وقت خدا نے، اسی سلسلہ کے مطابق، جو شروع سے چلا آرہا تھا،

ایک نبیؐ بھیجا اور اس کے ذریعے آسمانی تعلیم ایک بار پھر، انسانوں تک پہنچی، لیکن اس نبیؐ اور اس کی کتاب کی کچھ امتیازی خصوصیات تھیں، یعنی:۔

۱۔ سابقہ انبیائے کرامؑ صرف اپنی اپنی قوم کی طرف آتے تھے لیکن اس نبیؐ کو تمام دنیا کے انسانوں کی طرف رسولؐ بنا کر بھیجا گیا۔

قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (۷/۱۵۹)

کہہ دے! اے نوعِ انسان! میں تم سب کی طرف خدا کا رسول ہوں۔

۲۔ جب ”نوعِ انسان“ کہا گیا تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس میں قیامت تک آنے والے انسان شامل تھے۔ چنانچہ اس کی وضاحت کر دی کہ اگرچہ اس رسولؐ کی اوّلین مخاطب وہی قوم ہے، جس میں یہ پیدا ہوا ہے۔ لیکن یہ، ان کے علاوہ اُن انسانوں کے لئے بھی رسولؐ ہے جو اِن کے بعد آنے والے ہیں۔

وَّاٰخَرِيْنَ مِنْهُمْ لَمَّا يَلْحَقُوْا بِهِمْ (۶۲/۳)

اور ان کے علاوہ ان کی طرف بھی جو ابھی ان لوگوں سے نہیں ملے۔ (یعنی ان کے بعد آنے والے انسانوں کی طرف بھی۔)

تمام سابقہ کتابوں کی مہیمن

چنانچہ جو کتاب اس رسولؐ کی طرف بھیجی گئی، اس میں وہ ساری تعلیم یکجا کر دی گئی جو اصولی طور پر کتبِ سابقہ میں وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی تھی لیکن جو اس وقت دنیا میں کہیں موجود نہ تھی۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ .... (۵/۴۸)

اور ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی۔ یہ ان تمام دعاوی کو سچ کر کے دکھائے گی، جو کتبِ سابقہ میں کئے جاتے رہے ہیں اور ان تمام کتابوں کی تعلیم اس کے اندر آگئی ہے۔

۴۔ یہ بھی ضروری تھا کہ جو احکام اس کتاب میں دیئے جاتے، وہ صرف اس قوم کی حالت کے مطابق نہ ہوتے جو اس رسولؐ کی اوّلین مخاطب تھی بلکہ پوری نوعِ انسان کے حالات اور تقاضوں کو پیشِ نظر رکھ کر دیئے جاتے اور اس شکل میں دیئے جاتے کہ ان میں پھر کسی تبدیلی کی ضرورت پیش نہ آتی۔ نیز اس میں وہ سب تعلیم، جو تمام نوعِ انسان کو دی جانی مقصود تھی، مکمل شکل میں منضبط ہوتی کیونکہ اس کتاب کو ہمیشہ کے لئے بطور ضابطہ

حیات رہنا تھا۔ یعنی وہ مکمل بھی ہوتی اور غیر متبدّل بھی۔ یہ کتاب ایسی ہی ہے۔

مکمل اور غیر متبدّل

وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (۶/۱۱۶) تیرے رب کی طرف سے دیے جانے والے احکام و قوانین صدق اور عدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ اب ان میں تبدیلی کرنے والا کوئی نہیں۔

۵۔ جو کتاب ہر طرح سے مکمل ہو، اس میں کسی ردّ و بدل کی ضرورت نہ ہو، وہ تمام دنیا کے انسانوں کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے آسمانی ہدایت ہو، اس کا محفوظ رہنا ضروری تھا۔ چنانچہ اس کتاب کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔

محفوظ

إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُونَ ۔ (۱۵/۹)

ہم نے اس ضابطۂ حیات کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔

اس قسم کی حفاظت کہ کوئی غیر خداوندی بات اس کے قریب تک نہ پھٹک سکے۔

لَا يَأْتِيهِ الْبَاطِلُ مِنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهِ (۴۱/۴۲)

باطل اس کے آگے یا پیچھے، کہیں سے بھی اس کے پاس نہیں آسکے گا۔

اس رسولؐ کا نام ہے محمدؐ اور اس کتاب کا نام قرآن، جو چھٹی صدی عیسوی میں خدا کی طرف سے نازل ہوئی اور جسے مسلمانوں کی آسمانی کتاب کہا جاتا ہے، حالانکہ یہ درحقیقت تمام نوعِ انسان کی آسمانی کتاب ہے۔ ظاہر ہے کہ نبی، خدا کی طرف سے آتا ہی اس لئے تھا کہ وہ خدا کی وحی انسانوں تک پہنچائے۔ جب وہ وحی اپنی مکمل غیر متبدّل اور محفوظ شکل میں انسانوں کے پاس موجود ہو تو پھر کسی نبی کے آنے کی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ چنانچہ اس رسولؐ کے بعد نبوّت کے سلسلہ کو ختم کر دیا گیا اور اسے خَاتَمَ النَّبِيِّينَ ۔ (۳۳/۴۰) کہہ کر پکارا گیا۔

ختمِ نبوّت

یہ ہے وہ کتاب (قرآنِ مجید) جو اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں دنیا میں موجود ہے اور جس میں ایک حرف کا ردّ و بدل نہیں ہوا۔ اس دعوے کی تصدیق، خود اس کتاب کی داخلی شہادات اور تاریخ کے بیانات کرتے ہیں۔ پہلے داخلی شہادات کو لیجئے۔

کتابت کا رواج

زمانۂ نزولِ قرآن میں عربوں میں کتابت (لکھنے پڑھنے) کا رواج اتنا عام تھا کہ مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ: إِذَا تَدَايَنتُم بِدَيْنٍ إِلَىٰ

اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ‌ (۲/۲۸۲) "جب تم کسی مدت کے لئے لین دین کا معاملہ کرو، تو اسے لکھ لیا کرو"۔ اس کے بعد اس آیت میں اس لکھت پڑھت کے لئے تفصیلی ہدایات دی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اِس قسم کا حکم اُسی صورت میں دیا جا سکتا ہے، جب لکھنے پڑھنے کا رواج عام ہو۔ معاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے کی اہمیت یہ کہہ کر واضح کی کہ یہ اَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ ہوتا ہے (۲/۲۸۲) یعنی اس سے شہادت محکم ہو جاتی ہے۔

یہ واضح ہے کہ جس قوم کو عام لین دین کے معاملات کو ضبطِ تحریر میں لانے کا ایسا تاکیدی حکم دیا گیا تھا، اس قوم نے اپنی آسمانی کتاب کو تحریر میں لانے کے لئے کیا کیا اہتمام نہیں کئے ہوں گے جو اس کے لئے ضابطۂ زندگی تھی اور جس کی راہ نمائی کی اسے قدم قدم پر ضرورت پڑتی تھی۔ یہ کتاب ایک ہی بار نازل نہیں ہوئی تھی، نبی اکرمؐ کی تیئس سالہ نبوت کی زندگی میں، تدریجاً نازل ہوئی تھی۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً... (۲۵/۳۲)

کفار اعتراض کرتے ہیں کہ یہ قرآن، اس رسول پر (پورے کا پورا) ایک ہی بار کیوں نہ نازل ہو گیا۔

جوں جوں وحی نازل ہوتی تھی، اسے نہایت احتیاط سے ضبطِ تحریر میں لے آیا جاتا تھا۔ صحابہؓ اسے اپنے اپنے طور پر بھی لکھتے تھے لیکن بابِ نبوت کی طرف سے اس کا خاص اہتمام کیا جاتا تھا۔

قابلِ اعتماد کاتب

اور اس عظیم ذمہ داری کے لئے نہایت قابلِ اعتماد کاتبوں کا انتخاب عمل میں لایا جاتا تھا، جو نہ صرف فنِ کتابت ہی کے ماہر ہوں بلکہ سیرت و کردار کے اعتبار سے بھی رفیع المنزلت ہوں۔

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ ۝ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ ۝ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ۝ كِرَامٍۭ بَرَرَةٍ

(۸۰/۱۳-۱۶)

(یہ وحی) ایسے صحیفوں میں محفوظ کر دی جاتی ہے جو نہایت واجب العزت ہیں۔ رفیع الشان اور ہر قسم کی غلطیوں اور آمیزشوں سے پاک اور صاف۔ ایسے کاتبوں کے ہاتھ کی لکھی ہوئی، جو معاشرہ میں بڑی ہی عزت و تعظیم کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔

حفاظت کی غرض سے اسے عام طور پر ان اوراق پر لکھا جاتا تھا، جو (اس زمانے کے رواج کے مطابق) باریک کھال (رَقّ) سے بنائے جاتے تھے۔

وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ۝ (۵۲/۲-۳)

پھیلے ہوئے رَقّ پر لکھی ہوئی کتاب۔

اس طرح یہ وحی ایک کتاب کے اندر محفوظ ہوتی چلی جاتی تھی۔

إِنَّهُ لَقُرْآنٌ كَرِيمٌ فِي كِتَابٍ مَّكْنُونٍ۔ (۸-۷۷/۵۶)

یہ باعزت قرآن ہے، ایک محفوظ کتاب کے اندر۔

رسول اللہ اَن پڑھ نہیں تھے

یہ جو کہا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ ان پڑھ تھے، لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے، یہ صحیح نہیں۔ نبوت سے پہلے تو بیشک آپ کی یہی کیفیت تھی لیکن نبوت کے بعد یہ بات نہیں تھی۔

وَمَا كُنتَ تَتْلُو مِن قَبْلِهِ مِن كِتَابٍ وَلَا تَخُطُّهُ بِيَمِينِكَ (۲۹/۴۸)

اس (نبوت) سے پہلے نہ تو کتاب پڑھنا جانتا تھا، نہ اپنے ہاتھ سے لکھنا۔

مِن قَبْلِهِ۔ (اس سے پہلے) کی تخصیص اس امر کی شہادت دیتی ہے کہ نبوت کے بعد حضورؐ کی کیفیت ایسی نہیں رہی تھی، آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔

اس کتاب کی تلاوت مسلمانوں کے گھروں میں عام ہوتی تھی۔ خود نبی اکرمؐ کے اندرونِ خانہ کے متعلق قرآن میں ہے۔

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلَىٰ فِي بُيُوتِكُنَّ مِنْ آيَاتِ اللَّهِ وَالْحِكْمَةِ۔ (۳۳/۳۴)

(اے نبی کی بیویو!) جو کچھ تمہارے گھروں میں، احکامِ خداوندی اور ان کی غرض و غائیت (حکمت) کے متعلق (قرآن سے) پڑھا جاتا ہے، اسے ہمیشہ پیشِ نظر رکھو۔

حفّاظ

اس وحی کو نہ صرف کتاب کے ذریعے محفوظ کیا جاتا تھا، بلکہ اسے لفظ بلفظ حفظ بھی کیا جاتا تھا۔

بَلْ هُوَ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ فِي صُدُورِ الَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ۔ (۲۹/۴۹)

یہ واضح آیات ہیں ان لوگوں کے سینے میں (محفوظ) جنہیں (وحی) کا علم دیا گیا ہے۔

اس طرح اس کتاب کی دوہری حفاظت کی جاتی تھی — بذریعہ تحریر اور بذریعہ حفظ۔ ظاہر ہے کہ جو چیز اس طرح محفوظ کی جائے، نہ اس میں کسی غلطی کا امکان ہو سکتا ہے نہ اس کے تلف ہونے کا خطرہ۔ یہ کتاب خود ان لوگوں کی زبان میں تھی اور اس کا اندازِ بیان نہایت واضح تھا۔ بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِينٍ۔ (۲۶/۱۹۵) اس لئے ان لوگوں کو اس کے لکھنے یا حفظ کرنے میں کوئی دقت پیش آتی تھی، نہ اس کے سمجھنے سمجھانے میں کوئی مشکل۔ اس کی تلاوت ہر گھر میں ہوتی تھی اور اس کا چرچا ہر جگہ۔ وہ سفر و حضر میں اسے اپنے ساتھ رکھتے تھے کیونکہ یہ زندگی کے ہر گوشے میں

ان کے لئے ضابطۂ حیات تھی اور انہیں ہر مقام پر اس سے راہ نمائی لینے کی ضرورت پڑتی تھی۔

اس طرح یہ کتاب ساتھ کے ساتھ محفوظ ہوتی گئی اور جب نبی اکرمؐ اس دنیا سے تشریف لے گئے ہیں، تو یہ بلعینہٖ اسی شکل اور ترتیب میں جس میں یہ اس وقت، ہمارے پاس ہے، لاکھوں مسلمانوں کے پاس موجود، اور ہزاروں سینوں میں محفوظ تھی۔ اس کی مستند کاپی MASTER COPY مسجدِ نبویؐ میں ایک ستون کے قریب صندوق میں رکھی رہتی تھی۔ یہ وہ نسخہ تھا، جس میں نبی اکرمؐ سب سے پہلے وحی کو لکھوایا کرتے تھے۔ اُسے امام یا اُمؓ کہتے تھے اور اس ستون کو جس کے قریب یہ نسخہ رہتا تھا "اسطوانہ مصحف" کہا جاتا تھا۔ اسی ستون کے پاس بیٹھ کر صحابہ کرامؓ، نبی اکرمؐ کی زیرِ نگرانی، اس مصحف سے اپنے اپنے مصاحف نقل کیا کرتے تھے۔ اس کتاب کی اشاعت اس قدر عام ہو چکی تھی کہ جب نبی اکرمؐ نے اپنے آخری حج (حجۃ الوداع) کے خطبہ میں، لاکھوں نفوس کو مخاطب کر کے پوچھا کہ کیا میں نے تم تک خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے، تو چاروں طرف سے یہ آواز گونج اٹھی کہ ہاں، آپؐ نے اسے پہنچا دیا ہے۔ یہی تھی وہ کتاب، جس کے متعلق حضرت عمرؓ نے، نبی اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں، دیگر صحابہؓ کی موجودگی میں فرمایا تھا کہ "حَسۡبُنَا کِتَابُ اللّٰہِ" — ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے.... اور جس کے شک و شبہ سے بالاتر ہونے کے متعلق، خود اس کی اپنی شہادت موجود ہے۔ چنانچہ قرآنِ کریم کی تمہید (سورۂ فاتحہ) کے بعد، پہلی صورت (سورۂ بقرہ) کی ابتدا، ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ:-

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الۡكِتٰبُ لَا رَيۡبَ ۛ فِيۡهِ ۛ (۲/۳)

خدائے علیم و حکیم کا ارشاد ہے کہ یہ وہ کتاب ہے، جس میں کسی قسم کی شک والی بات نہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہ جو عام طور پر کہا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ، قرآن کو مرتّب شکل میں دے کر نہیں گئے تھے اور اس کو حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ میں جمع اور مدوّن کیا گیا تھا، یہ صحیح نہیں۔ "کتاب" تو کہتے ہی اسے ہیں جو مرتب شکل میں موجود ہو۔ علاوہ ازیں، ہماری کتبِ روایات میں بے شمار شہادات ایسی ملتی ہیں۔ جن سے واضح ہو جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ کے زمانہ میں قرآن کریم اسی ترتیب کے ساتھ مدوّن شکل میں موجود تھا۔ خلافتِ راشدہ کے زمانہ میں، اس کی عام نشر و اشاعت ہوئی۔ البتہ ایک ضرورت واضح تھی۔ افرادِ امت کے پاس قرآن کے اپنے اپنے نسخے تھے۔ مدینہ میں مستند صحیفہ MASTER COPY موجود تھا۔ اس لئے اہلِ مدینہ کو اس باب میں کوئی دقت محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ اپنے اپنے نسخوں کو اس مستند صحیفہ سے ملا کر، اپنے نسخہ کی صحت کے متعلق مطمئن اور متیقن ہو جائیں لیکن باہر والوں کو اس میں دقت پیش آ سکتی تھی، اسی

مقصد کے لئے ضروری تھا کہ قرآنِ کریم کے مستند نسخے، مختلف مراکز میں موجود ہوں۔ یہ نسخے حکومت کی طرف سے مرتب کر کے بھیجے جاتے تھے۔ لوگ ان نسخوں سے مقابلہ کر کے اپنے اپنے نسخوں کی تصحیح کر لیتے تھے۔

قرآن کے لاکھوں نسخے

امام ابن حزم نے لکھا ہے کہ خلیفۂ اوّل کے زمانے میں کوئی شہر ایسا نہیں تھا، جہاں لوگوں کے پاس بکثرت قرآنِ کریم کے نسخے نہ ہوں اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں، مسلمانوں کے پاس اس کتابِ عظیم کے لکھے ہوئے نسخے ایک لاکھ سے کم نہ تھے۔ (کتاب الفصل، الملل والنحل)۔ حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانے میں جو سات (یا بعض روایات کے مطابق آٹھ) مستند اور مصدقہ نسخے مرتب کرائے تھے اور ان میں سے ایک مدینہ میں رکھ کر باقی مختلف شہروں میں بھیجے تھے، ان کی تفصیل کتبِ تاریخ میں ملتی ہے۔

ضمناً اتنا اور سمجھ لینا چاہیئے کہ حضرت عثمانؓ کو جو "جامع القرآن" کہا جاتا ہے تو یہ بھی صحیح نہیں۔ آپ جامع القرآن نہیں تھے۔ دیگر خلفاء کی طرح، ناشرِ قرآن ہی تھے۔ انہوں نے البتہ اس کا اہتمام ضرور کیا تھا کہ کہیں کوئی ایسا نسخہ نہ رہے جو ان مستند اور مصدّقہ نسخوں کے مطابق نہ ہو اور ایسا کرنا نہائیت ضروری تھا۔ لوگوں نے جو نسخے اپنے اپنے طور پر مرتب کئے تھے، ان میں سہو اور خطا کا امکان ہو سکتا تھا۔ اس زمانے میں چھاپے خانے تو تھے نہیں، کہ حکومت اپنی زیرِ نگرانی قرآنِ کریم کے لاکھوں نسخے چھپوا کر تقسیم کر دیتی اور اس طرح غیر مصدّقہ نسخے باقی نہ رہتے۔ اس کے لئے یہی انتظام کیا جا سکتا تھا کہ مصدّقہ نسخے مختلف مراکز میں بھیج کر ہدائیت کر دی جاتی کہ لوگ ان کے مطابق اپنے اپنے نسخے مرتب کریں اور اگر کسی کے پاس کوئی ایسا نسخہ ہو، جو ان کے مطابق نہ ہو، اسے تلف کر دیا جائے تاکہ کسی ایسے نسخے کی اشاعت نہ ہونے پائے، جس میں کوئی غلطی ہو۔

حضرتِ عثمانؓ کے مصدّقہ نسخے

حضرت عثمانؓ نے اپنے مستند نسخوں میں سے جو نسخہ مدینہ میں رکھا (جسے امام کہتے تھے اور جو آپ کی شہادت کے وقت آپ کے سامنے موجود تھا) اس کا سُراغ قریب قریب مسلسل اور مربوط اطلاعات کے ذریعے چوتھی صدی ہجری تک ملتا ہے۔ (اس کے بعد تاریخی بیانات میں قدرے اختلاف پایا جاتا ہے) چنانچہ تیسری صدی کے ایک محقق ابوعبیدہ القاسم بن سلام (متوفّی ۲۲۳ھ) نے (کتاب القرآت میں) بیان کیا ہے کہ اس نے اس مصحف کو خود دیکھا تھا۔ مشہور سیّاح ابنِ بطوطہ کا بیان ہے کہ اس نے اسے (آٹھویں صدی ہجری میں) میں بصرہ میں دیکھا تھا۔ دسویں صدی ہجری میں (ابو تیمور کے زمانے میں) ابو بکر الشاشی نے اسے حضرت عبداللہ کے مزار پر رکھ دیا تھا۔ جب روس میں بالشویک حکومت ہوئی تو یہ نسخہ ان کے ہاتھ آگیا۔ اس کے متعلق، ۱۹۵۹ء میں روس کے ایک رسالہ (سوویٹ ویس) میں جو اطلاعات

شائع ہوئی تھیں۔ ان میں کہا گیا تھا کہ یہ (مصحفِ عثمانی) تیمور کے کتب خانہ میں تھا جو ۱۳۹۳ء میں سمرقند میں قائم کیا گیا تھا۔ اس کے بعد معلوم نہیں کن حالات کے ماتحت، یہ نسخہ اس کتب خانے سے نکل کر سمرقند کی مسجد خواجہ احرار میں آگیا اور صدیوں تک اس مسجد میں ایک سرمریں ستون سے زنجیروں کے ساتھ معلق رہا۔ ۱۸۶۸ء میں روسی شہنشاہیت بخارا پر قابض ہوئی تو روسی گورنر جنرل (وان کاف مان) نے اسے خرید کر، پیٹرس برگ کے شاہی کتب خانہ میں تحفۃً بھیج دیا۔ ۱۹۱۷ء کے انقلابِ روس کے بعد، یہ نسخہ، حکومت کے ایک فرمان کے مطابق، روسی پارلیمان کے مسلم نمائندوں کے ایک جلسہ بس اوفا پہنچا، پھر اسے تاشقند لایا گیا۔ روسی نشریہ میں اس نسخہ پر، حضرت عثمانؓ کے خون کے نشانات کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ روسی مستشرقین نے اس کی قدامت تسلیم کر لی ہے[1]۔

ایک نسخہ مدینہ میں موجود تھا، جسے جنگِ عظیم میں ترکی گورنر فخری پاشا، دوسرے متبرکات کے ساتھ قسطنطنیہ لے گئے تھے اور اب کہا جاتا ہے کہ) وہاں موجود ہے۔

ایک نسخہ کے متعلق مولانا شبلی نعمانی (مرحوم) نے لکھا تھا کہ انہوں نے اسے جامعہ دمشق میں (غالباً ۱۸۹۶ء میں) دیکھا تھا۔

ایک نسخہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ فاس میں ہے۔ ایک کتب خانہ خدیویہ (مصر) میں، ایک نسخہ جو کوفہ بھیجا گیا تھا، قسطنطنیہ میں ہے۔ ایک نسخہ لندن میں ہے۔

ان کے علاوہ متعدد صحابہؓ کے لکھے ہوئے نسخے ہندوستان، ایران، مصر، عرب اور ترکی کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں ملتے ہیں۔

لیکن اگر (بفرضِ محال) یہ نسخے اس وقت موجود نہ بھی ہوتے تو بھی قرآنِ کریم کی صحت کے متعلق کسی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ نبی اکرمؐ کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک، مسلمانوں کی عام آبادی ہی نہیں بلکہ ان کی سلطنتیں مختلف ملکوں میں مسلسل اور متواتر چلی آ رہی ہیں۔ قرآن پر ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ اس کا کم از کم ایک نسخہ ہر گھر میں موجود رہتا ہے۔ اس کی تعلیم ہر بچے کو دی جاتی ہے۔ اس کے متعلق (تفسیر وغیرہ کے سلسلہ میں) شروع سے آج

---

[1] ان معلومات کا ماخذ جناب ابو محفوظ الکریم معصومی صاحب کا ایک مضمون — بہ عنوان "مصحفِ عثمانی کے تاریخی نسخے" ہے جو علی گڑھ یونیورسٹی کے مجلہ "علوم اسلامیہ" کی دسمبر ۱۹۶۱ء کی اشاعت میں شائع ہوا تھا۔ ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ آخر میں اس مضمون کو بتمامہ درج کر دیا جائے۔

تک، ہزارہا کتابیں لکھی گئی ہیں۔ اس تمام دوران میں، قرآنِ کریم کے کسی ایک نسخہ کا سراغ تک نہیں ملتا جو دوسرے نسخوں سے مختلف ہو۔ علاوہ بریں، رسول اللہ کے زمانہ سے لے کر اس وقت تک لاکھوں کروڑوں کی تعداد میں قرآن کے حافظ مسلسل اور پیہم چلے آرہے ہیں۔ ہر سال کروڑوں مسلمانوں کی موجودگی میں (رمضان المبارک) میں قرآن کریم کو دہرایا جاتا ہے اور یہ سلسلہ بھی صحابہؓ کے زمانہ سے متواتر چلا آرہا ہے۔ ان حالات میں کیا اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ قرآنِ کریم اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں اُمّت کے پاس مسلسل چلا آرہا ہے؟

اختلافِ قرأت

بعض اوقات آپ کے سننے میں یہ بات آتی ہوگی کہ "فلاں صحابی کی قرأت میں یوں آیا ہے یا اس آیت کی دوسری قرأت یوں ہے"۔ مختلف قرأتیں ہی نہیں، بلکہ بعض روایات میں صحابہؓ کے ایسے مصاحف کا بھی ذکر آتا ہے جو مصحف عثمانی سے مختلف تھے لیکن ان روایات کی چھان بین کے بعد یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ اس قسم کی تمام روایات وضعی یا ضعیف ہیں اور دشمنانِ اسلام کی سازشوں کا نتیجہ۔ مقصد اس سے یہ تھا کہ قرآنِ کریم کے غیر محرّف ہونے کے متعلق شبہات پیدا کئے جائیں۔ چنانچہ یورپ کے متعدد متعصّب عیسائیوں نے ان روایات کو خوب اُچھالا ہے لیکن جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے۔

غیر مسلموں کی شہادات

چنانچہ خود وہیں کے متعدد اربابِ فکر و نظر نے ذاتی تحقیق کے بعد اس حقیقت کا اعتراف و اعلان کیا ہے کہ قرآنِ کریم غیر محرّف ہے اور اس میں ایک حرف کی بھی کمی بیشی یا تغیر و تبدل نہیں ہوا مثلاً مشہور مستشرق HORTWIG HIRSCHFELD اپنی کتاب "NEW RESEARCHES INTO THE COMPOSITION AND EXEGESIS OF THE QURAN" میں لکھتا ہے:۔

"عہدِ حاضر کے نقاد اس پر متفق ہیں کہ قرآن کے موجودہ نسخے اس اصلی نسخے کا ہو بہو عکس ہیں، جسے (حضرت) زیدؓ نے لکھا تھا اور قرآن کا متن بعینہٖ وہی ہے، جسے محمدؐ نے (لکھا کر) دیا تھا"۔

سر ولیم میور جیسا متعصب اہلِ قلم، اپنی کتاب 'LIFE OF MOHAMMAD' میں لکھتا ہے:۔

"یہ یقینی بات ہے کہ قرآن جس شکل میں ہمارے پاس اس وقت موجود ہے، یہ بعینہٖ اسی شکل میں (حضرت) محمدؐ کی زندگی میں جمع اور مرتّب ہو چکا تھا"۔

کچھ سال اُدھر، سر جان ہمرٹن کے زیرِ اہتمام، یونیورسل انسائیکلو پیڈیا، گیارہ جلدوں میں شائع ہوا تھا۔ اس میں "قرآن" کے عنوان سے جو مقالہ درج ہے، اس میں تحریر ہے:۔

"یہ کتاب، پیمبر محمدؐ پر، اُن کی زندگی کے آخری تیئس سال میں مکہ اور مدینہ میں نازل ہوتی رہی اور مسلمانوں کے عقیدہ میں کلامِ الٰہی ہے۔ بہ خلافِ حدیث کے جو مجموعۂ کلامِ رسولؐ ہے۔ قرآن پیمبرؐ کی زندگی ہی میں اور انہی کی زیرِ ہدایت و نگرانی ضبطِ تحریر میں آگیا تھا اور ان کے صحابیوںؓ نے اسے حفظ یاد کرلیا تھا اور یہ معمول آج تک جاری ہے۔ چنانچہ صدہا مسلمان کلامِ پاک کے حافظ ہیں اور اسے سارے کا سارا دہرا سکتے ہیں بغیر کسی ایک غلطی کے۔
اس کتاب کا دعویٰ ہے کہ اس میں تمام کتبِ آسمانی کے حقائق آگئے ہیں اور یہ کہ وہ آخری اور ناقابلِ تغیر کتاب ہے۔ نیز یہ کہ نوعِ انسان کے لئے وہ جامع ترین دستور العمل ہے اور اسلام، یعنی دینِ فطرت کی آخری توضیح ہے اور یہی دینِ ابراہیم و موسےٰ و عیسےٰ (علیہم السلام) اور سارے قدیم انبیاءؑ کا رہ چکا ہے۔
اس کی عبارت کا غیر محرّف ہونا مسلّم ہے"۔

اپنوں کی نہیں، بلکہ غیروں کی ان شہادات کے بعد، کیا اس حقیقت کے تسلیم کرنے میں کوئی شبہ رہ جاتا ہے کہ قرآنِ کریم بعینہٖ اسی شکل میں ہمارے پاس موجود ہے، جس شکل میں اسے نبی اکرمؐ نے اُمّت کو دیا تھا؟

شیعہ حضرات کا اعتراف

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ شیعہ حضرات موجودہ قرآن کو غیر محرّف نہیں مانتے۔ وہ کہتے ہیں کہ قرآن میں ردّ و بدل ہوا ہے لیکن اب شیعہ حضرات کے بعض مجتہد اس حقیقت کا اعلان کر رہے ہیں کہ قرآن میں کسی قسم کا ردّ و بدل نہیں ہوا۔ مثلاً شیعی دنیا کے نامور فاضل شیخ محمد حسین الکاشف الغطا کی کتاب اصل الشیعہ و اصولھا کا اُردو ترجمہ "اصل و اصولِ شیعہ" رضا کار بک ڈپو لاہور نے شائع کیا تھا۔ اس میں وہ لکھتے ہیں:-

"وہ کتاب جو اس وقت مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے، یہ وہی ہدایت نامہ ہے جسے پروردگارِ عالم نے معجزہ بنا کر نازل کیا اور اس کے ذریعے احکامِ دین کی تعلیم دی، نہ اس میں کوئی کمی ہوئی نہ زیادتی۔ مسلمانوں میں جو لوگ تحریف کے قائل ہیں، وہ خطا پر ہیں کیونکہ اس اعتقاد سے نصِ قرآنی — اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ — کی تردید ہوتی ہے۔ (ص ۶۳) (۱۵/۹)

ان تصریحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہو گی کہ وہ تعلیم جسے خدا نے وحی کے ذریعے انسانوں کی ہدایت کے لئے بھیجا تھا، اس آسمان کے نیچے، قرآنِ کریم کے علاوہ اور کہیں بھی اپنی اصلی اور حقیقی اور غیر محرّف شکل میں موجود نہیں۔ لہٰذا جب قرآن یہ کہتا ہے کہ جو شخص بھی آسمانی راہ نمائی کے مطابق چلنا چاہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ رسالتِ محمدیہ پر ایمان لائے اور قرآنِ کریم کو اپنے لئے ضابطۂ حیات بنائے، تو وہ ایک ایسی حقیقت کا اعلان کرتا ہے۔ جس کا اعتراف تمام دنیا کے انسانوں کو ہے۔ یعنی ایک طرف، مختلف مذاہب کے پیرو اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ (اور تاریخ اس کی گواہی دیتی ہے) کہ ان میں سے کسی کے پاس بھی وہ کتاب اپنی اصلی اور غیر محرّف شکل میں موجود نہیں جو ان کے نبیؑ (یا ان کے الفاظ میں ان کے بانیٔ مذہب) کو ملی تھی — اور دوسری طرف خود غیر مسلموں تک کو اعتراف ہے (اور واقعات اس کی شہادت دیتے ہیں) کہ قرآنِ کریم اپنی حقیقی اور غیر محرّف شکل میں دنیا کے پاس موجود ہے۔ لہٰذا آسمانی راہ نمائی کے طالب کے لئے اس کے سوا چارہ ہی نہیں کہ وہ قرآنِ کریم کو اپنا راہ نما بنائے[1]۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں[2]۔" وہ نہ صرف یہ کہ قرآن کے دعویٰ کی کھلی ہوئی تردید کرتے ہیں بلکہ تاریخی حقیقت کا بھی بطلان کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ عالمگیر سچائیاں، اپنے وقت میں، ہر رسولؑ نے پیش کی تھیں لیکن اب وہ سچائیاں، قرآن کے علاوہ اور کہیں موجود نہیں کیونکہ کسی مذہب کے پاس ان کی آسمانی کتاب اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں۔ اب حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں کہ:۔

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ (۴۷/۲)

---

[1] یہ حقیقت کہ قرآنِ کریم خدا کا کلام ہے، ایک جداگانہ موضوع ہے، جس کا زیرِ نظر تالیف سے تعلق نہیں۔ میری مختلف تصانیف اور مقالات میں اس حقیقت کو واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ قرآنِ کریم خدا کی طرف سے نازل کردہ آخری، اکمل اور واحد ضابطۂ حیات ہے جو تمام نوعِ انسان کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے اور اس دنیا کی سرفرازیوں اور آخرت کی سعادتوں کا ضامن ہے۔ اس کتاب میں ہم صرف اس تاریخی حقیقت سے بحث کر رہے ہیں کہ آسمانی کتابوں کا دعویٰ کرنے والوں میں کسی کے پاس بھی غیر محرّف آسمانی کتاب نہیں۔

---

[2] مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (ترجمان القرآن جلد ۱)

"اور جو لوگ ایمان لائیں اور اعمالِ صالح کریں۔ یعنی وہ ایمان لائیں اس پر جو محمدؐ پر نازل کیا گیا ہے اور وہی ان کے رب کی طرف سے (اب) حق ہے، تو ان کی ناہمواریاں دور کردی جائیں گی اور ان کی حالت سنور جائے گی۔

اس کی وجہ کیا ہے؟

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ (۴۷/۳)

"یہ اس لئے کہ جو لوگ (اس قرآن سے) انکار کرتے ہیں، وہ باطل کا اتباع کرتے ہیں اور جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں، وہ اس حق کا اتّباع کرتے ہیں جو ان کے رب کی طرف سے نازل ہوا ہے"۔

اور قرآن کے اس دعویٰ کی صداقت پر تاریخ شاہد ہے۔

مصحفِ عُثمانی کے تاریخی نسخے

(ابو محفوظ الکریم معصومی)

مصاحفِ عثمان کی تعداد میں اقوال[1] بہت مختلف ہیں۔ غالباً صحیح یہ ہے کہ کل آٹھ نسخے تھے، جن میں سے ایک حضرت عثمانؓ کے پاس رہا۔ قُرّاء کی ایک جماعت[2] اسی کو "الامام" کہتی ہے۔ کچھ لوگ "امام" کا اطلاق "مصاحفِ امصار" پر بھی کرتے ہیں، اور ہمارے خیال میں ان تمام نسخوں میں سے ہر ایک کی اپنی جگہ جو حیثیت مسلّم تھی، اس کے اعتبار سے تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ بہرحال باقی سات نسخے مدینہ، مکہ، بصرہ، کوفہ، شام، یمن اور بحرین کو بھیجے گئے۔ ابن کثیر نے بحرین کی جگہ مصر کا ذکر کیا ہے[3] اور مصحفِ خاص کو شمار نہیں کیا۔ مؤرخ یعقوبی کا بیان سب سے الگ ہے۔ اس نے مذکورہ بالا مقامات کے ساتھ مصر اور الجزیرہ کو شامل کر کے "مصاحفِ امصار" کی تعداد ۹ تک پہنچا دی ہے[4]۔

ح۱ کتاب المصاحف، باب نقط المصاحف وغیرہ بالدانی، کتاب المحکم فی نقط المصاحف ص۱، کتاب المصاحف ص۳۴، الدانی: المقنع ص۱، العواصم والقواصم (ص ۲ - ۱۹۳، ۲۰۴) ابن الجزری طیبۃ النشر (۱: ۷) فتح الباری (۹: ۱۶) الکردی: ۷۹، الزرقانی مناہل العرفان (۱: ۳۹۵، ۳۹۶)

ح۲ مثلاً ابو عبید القاسم بن سلام (م ۲۲۴ھ) ابوبکر بن ابوداؤد (م ۳۱۶) دیکھئے کتاب المصاحف ص ۴۴۔ المقنع ص ۱۶، ابن کثیر کے الفاظ میں ویقال لهذہ المصاحف الائمۃ لك البدایۃ والنہایہ (۷: ۲۱۶) امام مالک کے ایک مقولہ میں الامام کا لفظ اصل نسخۂ عثمانی کی نقل پر اطلاق کیا گیا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں: ولا یزال الانسان یسألنی عن نقط القرآن فاقول لہ، اما الامام عن المصاحف فلا اریٰ ان ینقط "کتاب المحکم فی نقط المصاحف؛ ص ۱۱ تحقیق الدکتور عزۃ حسن ۱۹۶۰

ح۳ البدایۃ والنہایۃ (۷، ۲۱۶)

ح۴ تاریخ الیعقوبی (۲: ۱۴۷) طبع نجف۔

یمن اور بحرین کے نسخوں کے علاوہ مصحف خاص اور مصاحف خمسہ عامہ کے بارے میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اس لئے کہ ان چھ نسخوں کے رسم الخط کے متعلق تمام تفصیلات قراء کی روایتوں میں متداول و معروف ہیں[1]۔ البتہ یمن اور بحرین کے نسخوں کی بابت محققین قرأت کا یہ اعتراف ملتا ہے کہ ان روایتوں میں ان دو مصحفوں کا حوالہ نہیں آتا۔[2]

تاریخی روایات میں متعدد مصاحف کا تذکرہ ملتا ہے، جن کی شہرت حضرت عثمانؓ کے شائع کردہ مصاحف کے اصلی نسخوں کی حیثیت سے تھی۔ ان نسخوں کے متعلق منتشر اطلاعات کا خلاصہ ذیل کی سطروں میں پیش کیا جاتا ہے، مگر اس کے ساتھ ہی یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ کسی قدیم مصحف کو اصل نسخۂ عثمانی کی حیثیت سے مشہور کر دینا جس قدر آسان ہے، اس کی اصلیت کا ثابت کرنا اسی قدر دشوار ہے۔ کوئی قدیم نسخہ، جس کے خط کی قدامت مسلّم ہو، جس میں نقطے اور اعراب نہ لگے ہوں۔ جس کی لکھائی کھال یا قرطاس[3] پر ہو۔ جس کی تقطیع عہدِ صحابہ و تابعین کی روایتی تقطیع کے مطابق اور جس کی رسم، رسمِ عثمانی ہو۔ غرض اس میں تمام خصوصیات پائی جاتی ہوں، پھر بھی اسے اصل نسخۂ عثمانی قرار دینے کے لئے کوئی یقینی ذریعہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ اسی دشواری کی وجہ سے علامۂ سمہوری نے "مصحفِ مدینہ" کے سلسلہ میں بحث و تمحیص کے بعد یہ لکھا ہے۔ "لیس معنا نی اہ را لمصحف الموجود الیوم سوی مجرد احتمال"[4] جن نسخوں کا تذکرہ ذیل میں درج کیا جا رہا ہے۔ ہمیں اعتراف کر لینا چاہیئے کہ ان کے متعلق جملہ تاریخی معلومات کا استقصا کرنا ہمارے لئے ممکن نہ تھا اور معلوم نہیں کہ ان نسخوں کے علاوہ اور کتنے نسخے ہوں گے۔ جن کی بابت ہمارے پاس کوئی اطلاع نہیں۔

---

[1] کتاب المصاحف، کتاب المقنع اور دوسری تمام فنی کتابیں۔

[2] فتح الباری (۹: ۲۶) جمیلہ شرح المقید، ورق ۱۳ اب "فلم نسمع لھما خبراً ولا علمنا من نفذ معھما"۔ جمبری نے یہ الفاظ ابو علی (الاہوازی ؟) کے حوالہ سے نقل کئے ہیں۔

[3] قرطاس کا استعمال دورِ جاہلیت میں ہوا کرتا تھا۔ اس کا ثبوت خود قرآنِ مجید میں ملتا ہے۔ سورۃ الانعام، رکوع ۱، آیت ۶، نیز رکوع ۱۱، آیت ۱۔ غالباً شام سے اس کی درآمد ہوتی تھی۔ طرفہ بن العبد کا شعر ہے۔ وخد کقرطاس الشامی ومشفر کسبت الیمانی قدہ لم یجرد عہد عثمانی کے متعلق عام طور پر مشہور ہے کہ مصاحف کی کتابت کھال پر ہوتی تھی لیکن تعددِ نسخ کے پیش نظر ممکن ہے کہ قرطاس بھی استعمال کیا گیا ہو۔ خاص طور پر صحفِ صدیقی کے بارے میں سالم اور خارجہ بن زید کا بیان ہے۔ "ان ابا بکر کان جمع القرآن فی قراطیس" کتاب المصاحف ص ۹۔ یہی الفاظ ابن حجر نے براہِ راست نقل کئے ہیں۔ دک فتح الباری (۹: ۱۳)۔ (۴) وفاء الوفا (۱: ۴۸۲)

مصحفِ خاص مصحف کا خاص نسخہ جو حضرت عثمانؓ کے سامنے بوقتِ شہادت موجود تھا، اس کا سراغ تقریباً مسلسل و مربوط اطلاعات کے ذریعہ چوتھی صدی ہجری کے وسط تک ملتا ہے۔

ہمارے علم میں اس نسخہ کے متعلق قدیم ترین اطلاع عمرۃ بنت قیس العدویہ[۱] کی ہے جو احمد بن محمد بن حنبل کے صاحبزادے عبداللہ کی سند سے "کتاب الزہد" میں درج ہے[۲]۔ عمرۃ العدویہ واقعۂ شہادت کے بعد ہی مدینہ پہنچی تھیں اور ان کو مصحفِ خاص کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں:

فرأینا مصحف الذی قتل وھو فی حجرہ، فکانت اوّل قطرۃ قطرت من دمہ علیٰ ھذہ الایۃ: فسیکفیکھم اللہ وھو السمیع العلیم؛ قالت عمرۃ، فما مات منھم رجل سویا۔

خود آلِ عثمان کا بیان، بظاہر روائیتِ مذکورہ کے خلاف، حجاج بن یوسف کے ایک ملازم ثابت مولیٰ سلمۃ بن عبدالملک کی زبانی منقول ہے کہ جس وقت حجاج کی طرف سے منقوط مصاحف کی اشاعت کی گئی، ایک نسخہ مدینہ کے لئے بھی ارسال کیا گیا۔ حجاج کا مصحف دیکھ کر آلِ عثمانؓ کچھ بیزار ہوئے اور ان سے کہا گیا کہ حضرت عثمانؓ کا مصحف نکال کر دیں تو اسی کی قرأت کی جائے مگر آلِ عثمانؓ نے جواب دیا کہ وہ نسخہ تو شہادت کے دن ہی تلف ہو گیا[۳]۔

اس روائیت کے الفاظ بتاتے ہیں کہ خود اہلِ مدینہ اس کے تلف ہو جانے کے قائل نہیں تھے۔ دوسرے واقعات اور شواہد سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ طبقۂ تبع تابعین میں سے خالد بن ایاس العدوی المدنی[۴]، جو مسجد نبویؐ کے مشہور پیش امام تھے، انہوں نے مصحفِ خاص کی قرأت ایسی دقّتِ نظر کے ساتھ کی تھی کہ آج تک مصحفِ خاص کی خصوصیتیں ان کے حوالے سے فنِ قرأت کی کتابوں[۵] میں محفوظ ہیں۔ ان کے سوا ثابت مولیٰ سلمہ،

۱۔ دیکھئے تہذیب التہذیب (۱۲: ۴۴۰) رقم ۲۸۵۴۔ تقریب التہذیب، ص ۶۶۲ طبع نولکشور لکھنؤ، ۱۹۲۷ء۔

۲۔ کتاب الزہد، ص ۱۲۷۔۱۲۸، ام القریٰ ۱۳۵۷ھ ۳۔ سمہودی، وفاء الوفا (ص ۴۸۱)

۴۔ خالد بن الیاس او ایاس دیکھئے تہذیب التہذیب (۳: ۸۰) رقم: ۱۵۲، میزان الاعتدال (۱: ۲۹۵) رقم ۲۳۶۱ طبع مصر ۱۳۲۵ھ، ابن ابی داؤد، خالد بن ابی ایاس ویقال ابی ایاس، کتاب المصاحف (ص ۴۲)

۵۔ کتاب المصاحف، ص ۳۷۔ جمیلۃ ارباب المراصد ورق ۱۴۔

کے بیان کا ناقل محرز بن ثابت آلِ عثمان کے جواب پر قناعت نہیں کرتا اور اپنی تحقیق کے بموجب یہ اطلاع دیتا ہے[1] کہ مصحفِ عثمان رض، خالد بن عمرو بن عثمان کے پاس محفوظ تھا[2]۔

اس سلسلے میں امام مالکؒ کا قول نقل کیا جاتا ہے، جس کا خلاصہ بس اتنا ہے کہ ان کو اپنے شیوخ سے اس نسخے کی بابت کسی طرح کی اطلاع نہیں پہنچی۔ اصل الفاظ بہ روایت[3] شاطبی (م ۵۹۰ھ) یہ ہیں: "ان مصحف عثمان رضی اللہ عنہ تغیب فلم یجد لہ خبرا بین الاشیاخ" ان الفاظ کی حد تک یقیناً آلِ عثمان رض کے دعوے کی تصدیق نہیں ہوتی لیکن ابن ابی داؤد نے بہ روایت ابن وہب جو قول نقل کیا ہے۔ وہ مذکورہ بالا الفاظ سے بالکل مختلف نظر آتا ہے۔ "قال سألت مالکا عن مصحف عثمان رضی اللہ عنہ فقال لی ذهب[4]"، تاہم اس سے کوئی قطعی پہلو مصحف کے تلف ہو جانے کا نہیں نکلتا۔

بہرحال اس نسخے کا وجود جن مذکورہ بالا شواہد سے ثابت ہوتا ہے، ان کی قوت میں شبہ نہیں۔ پھر تیسری صدی کے اوائل کے ایک مستند اور مشہور محقق ابو عبیدہ القاسم بن سلام (۱۵۰ھ - ۲۲۳ھ) کا نسخۂ خاص عثمانی سے شرف اندوز ہونا اس مسئلہ کو طے کر دینے کے لئے کافی ہے۔ ابو عبیدہ نے "کتاب القراءت" میں بیان کیا ہے[5] کہ حضرت عثمان رض کا مصحف "امام" میں نے خود دیکھا ہے، بعض امراء کے خزانے میں محفوظ تھا اور میری فرمائش پر نکالا

---

[1] وفاء الوفا (۱: ۴۸۱)

[2] دیکھئے مصعب الزبیری، کتاب نسب قریش، ص ۱۰۶، ابن قتیبہ، کتاب المعارف۔ ص ۹۹۔

[3] وفاء الوفا (۱: ۴۸۱) یہ الفاظ شاطبی کی نظم "عقیلۃ اتراب القصائد" کی مندرجہ ذیل ابیات سے ماخوذ ہیں ؎

وقال مالک القرآن یکتب بالکتاب الاول لا مستحدثا سطرا ۔ وقال مصحف عثمان تغیب لم یجد
لہ بین اشیاخ الھدی خبرا۔

[4] کتاب المصاحف، ص ۳۵۔

[5] وفاء الوفا (۱: ۴۸۱) اصل ماخذ شاطبی کا قصیدہ ہے۔ جس میں منقولہ بالا شعروں کے بعد یہ اشعار ہیں۔

ابو عبیدہ اتوا بعض الخزائن لی ۔ استخرجوہ ما بصرت الدما اثرا
وردہ ولد النحاس معتمدا ۔ ما قبلہ واباہ منصف النظرا
اذ لم یقل مالک لاحت ہیاکلہ ۔ مالا یفت فیوجی طال او قصرا

گیا تھا۔ یہ وہی نسخہ تھا جو شہادت کے موقع پر حضرت عثمانؓ کے سامنے تھا۔ اس میں کئی جگہ خلیفۂ شہیدؓ کے خون کے وھبّے موجود تھے اور سب سے زیادہ نشانات سورۂ "والنجم" میں تھے[1]۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ ابو عبیدہ نے کس امیر کے خزانے میں اس نسخۂ یگانہ کو دیکھا تھا۔ ان کے تعلقات خصوصی[2] جن امرائے دولت سے قائم تھے، ان میں طاہر بن الحسین (م ۲۰۷ھ) اور ثابت بن نصر بن مالک الخزاعی (م ۲۰۸ھ) مشہور شخصیات تھیں۔ ثابت بن نصر ۱۷ سال تک "ثغور الشام" کا والی رہا۔ ابو عبیدہ بھی کم و بیش ۱۸ رسال طرسوس کے عہدۂ قضا پر مامور رہا اور بہت جلد معلوم ہو گا کہ زیرِ بحث نسخہ تیسری صدی کے اواخر تک "جند حمص" کے ایک شہر میں کس طرح پہنچ کر عوام و خواص کے لئے مرکزِ توجّہ بن گیا تھا۔ لہٰذا ہمارا اندازہ ہے کہ یہ نسخہ کہیں شام کے علاقے میں ابو عبیدہ کی نظر سے گزرا ہو گا۔

تیسری صدی کے اواخر میں ابن قتیبہ دینوری (م ۲۷۶ھ) کے ذریعے اطلاع ملتی ہے کہ قرآنِ کریم کا وہ نسخہ جو حضرتِ عثمانؓ کی گود میں تھا، خالد بن عثمانؓ[3] کے پاس، پھر اس کی اولاد کے قبضے میں رہا مگر ان لوگوں کی نسل منقطع ہو

ح۱ سورۂ والنجم کا ذکر سمہودی نے نہیں کیا ہے۔ جمبری کی شرح عقلیہ میں اس کی تصریح ہے۔ "ورایت اثار الدم فی مواضع منه واکثرما رایته فی سورة والنجم"۔ مخطوطہ، ورق ۱۵ الف۔

ح۲ دیکھئے۔ تاریخ بغداد (۱۲: ۴۱۲) رقم ۶۸۶۸، زبیدی، طبقات النحویین واللغویین ص ۲۱۷ (مصر ۱۹۰۴ء) ابن خلکان (۱۳: ۲۲۵) رقم ۵۰۰: ۷۔ انباہ الرواۃ (۲: ۱۳) رقم ۵۵۰۔ معجم الادباء (۱۶: ۲۰۵) السبکی، طبقات الشافعیہ (۱: ۲۷۱)

ح۳ دیکھئے۔ نسب قریش ص ۱۱۹ محرز بن ثابت نے خالد بن عمرو بن عثمانؓ کا ذکر کیا ہے۔ اس اختلاف کا اثر نفس مسئلہ پر نہیں پڑتا۔ نیز ابن قتیبہ کی تائید بلاذری سے ہوتی ہے لیکن بلاذری اور ابن قتیبہ کی یادداشتوں میں زبردست اختلاف یہ ہے کہ بلاذری کی صراحت کے مطابق خالد بن عثمان حضرت عثمانؓ کی زندگی میں فوت ہوئے مگر مصحف خاص کے بارے میں اس کا بیان ہے کہ خالد بن عثمان کے لڑکوں کے قبضہ میں تھا۔ اصل الفاظ یہ ہیں۔ واما خالد بن عثمان بن عفان، فتوفی فی خلافة ابیه، رکض دابة فاصابه قطع فهلك منه وله عقب وهوالذی یقال له الکسیر، وکان مصحف عثمان الذی قتل وهو فی حجره عند ولده۔ انساب الاشراف (۵: ۱۶) اس کے برعکس ابن قتیبہ کے الفاظ بھی اپنی جگہ صریح ہیں کہ خالد بن عثمان شہادت عثمانؓ کے بعد فوت ہوئے۔ ابن قتیبہ کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ مصعب الزبیری نے حضرت عثمان کے ورثا میں خالد کو شمار کیا ہے۔ نسب قریش۔ ص ۱۱۲۔

گئی اور مصحف کے بارے میں ابن قتیبہ کو مشائخ شام کی زبانی یہ اطلاع پہنچی کہ اب طرطوس میں موجود ہے[۱]۔

ابو عبید اور ابن قتیبہ جیسے بلند پایہ محقّقوں کے بعد چوتھی صدی کے دو مشہور جغرافیہ نویس اصطخری اور ابن حوقل، انطرطوس (طرطوس[۲]) کے ذکر میں خصوصیت کے ساتھ اس 'اثری مصحف' کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اگرچہ اس دور میں ابو جعفر النحاس (م ۳۳۸ھ) نے امام مالک کے قول سے استناد کرتے ہوئے مصحفِ خاص کے وجود سے انکار کر دیا تھا مگر ان تمام شواہد کے ہوتے ہوئے امام مالک کے غیر صریح قول سے استدلال کرنا کسی طرح درست معلوم نہیں ہوتا[۳]، اور امام شاطبی نے اس بنا پر نحاس کے انکار کو غلط قرار دے دیا ہے[۴]۔

جامع عتیق مصر کا نسخہ

چوتھی صدی کے تقریباً نصف میں مصحف شریف کا ایک نسخہ ایک عراقی تاجر کے ذریعہ مصر پہنچا[۵]۔ عراقی کا دعویٰ تھا کہ یہ نسخہ عباسی خلیفہ المقتدر (م ۳۲۰ھ) کے خزانے سے حاصل کیا گیا ہے اور یہ حضرت عثمانؓ کا مصحف خاص ہے۔ جس میں خون کے دھبے ہیں۔ یہ نسخہ عراقی تاجر کے ذریعہ مصری امیر عبداللہ بن شعیب کے قبضہ میں آیا۔ پھر ابوبکر محمد بن عبداللہ الخازن[۶] (م ۳۵۷ھ تقریباً) نے اس کی حفاظت کا اہتمام کیا اور اسے ایک منقش صندوق میں رکھ کر فسطاط کی جامع عتیق میں محفوظ کر دیا۔ کچھ لوگ اس کے مصحفِ عثمانی ہونے کے منکر تھے کہ اس کی اصلیت تنہا عراقی تاجر نے بیان کی تھی لیکن مصر کے ایک مؤرخ ابن المتوج (محمد بن عبدالوہاب، م ۷۳۰ھ) نے اس انکار کو قبیلۂ "تجیب" اور اس کے حلیفوں کے تعصّب کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

۱۔ سمہودی (۱: ۴۸۲) جعبری؛ شرح العقلیہ ورق ۱۵ الف۔ نیز شاطبی کے ابیات مذکورہ۔

۲۔ المقریزی، الخطط، (۴: ۱۹) طبع مصر ۱۳۲۶ھ۔ الخطط توفیقیہ (۴: ۷)۔

۳۔ الخطط (۴: ۱۱)

۴۔ یہ فقرہ کتاب المعارف میں نہیں ہے۔ ابن قتیبہ کی دوسری کتاب سے ماخوذ ہے۔

۵۔ طرطوس کا ذکر جعبری نے "شرح العقلیہ" میں کیا ہے۔ (ورق ۱۵ الف) اور اس کی صحت میں شک نہیں۔ سمہودی کی "وفاء الوفا" میں "طوس" ہے (۱: ۴۸۲) یہ تصحیف قلمی نسخہ یا مطبع کی ہے جو محی الدین عبدالحمید کے ایڈیشن میں بھی قائم ہے۔ وفاء الوفا۔ (۲: ۶۶۹) طبع مصر ۱۹۰۴ء م۔

۶۔ کتاب المسالک والممالک ص ۶۱، ابن حوقل ص ۱۱۷، (۲: ۱۸۷۲م) ابوالفداء، تقویم البلدان، ص ۲۲۹ (۱۸۴۰) استرینج، بلاد فلسطین و شام ص ۴۷۰، دکن ۱۹۳۲۔

مصحف کے سرورق پر جو وقفیہ درج کیا گیا تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے عراقی تاجر مسعود بن سعد نے خود ہی نسخے کو وقف کیا تھا اور جامع عتیق میں یہ مصحف یکم ذوالقعدہ ۳۴۷ھ کو رکھا گیا تھا لیکن پوری تحریر میں نسخے کی تحریری اہمیت پر کوئی روشنی ڈالی نہیں گئی ہے۔ علامہ مقریزی (م ۸۴۰) کے حوالہ سے پورا وقفیہ درج ذیل ہے:-

بسم الله الرحمٰن الرحيم، الحمد لله رب العلمين هذا المصحف الجامع الكتاب الله جلّ ثناؤه وتقدست أسماؤه حمله المبارك مسعود بن سعد (بن سعيد)[1] السجستانى[؟] لجماعة المسلمين القراء القرآن التالين له، المتقربين إلى الله جل ذكره بقراءته، والمتعلمين له، ليكون محفوظا ابدا ما بقي ورقه ولم يذهب رسمه[2] ابتغاء ثواب الله عزّ وجلّ، ورجاء غفرانه وجعل عدة[3] ليوم فقره وفاقته وحاجته اليه، انا له ذالك برأفته وجعل ثوابه بينه وبين جماعة من نظر فيه (وتبصر في ورقه، وقصد بايداعه)[4] فسطاط مصر، في المسجد الجامع جامع المسلمين العتيق، ليحفظ حفظ مثله مع سائر مصاحف المسلمين فرحم الله من حفظ، ومن قرأ فيه ومن عمل[5] به، وكان ذلك في يوم الثلاثاء مستهل ذي القعدة سنة سبع وأربعين وثلثمائة، وصلى الله على محمد سيد المرسلين، وعلى آله وسلم تسليما كثيرا وحسبنا الله ونعم الوكيل۔"

---

[1] یہ اضافہ ایک قلمی نسخے سے کیا گیا ہے۔ (نسخۂ مجمع اسیاٹک کلکتہ ۱۶۰-F 01 رقم A1285) مقابلہ کیجئے۔ مطبوعہ سے (۴: ۱۹)، مطبعۃ النیل القاہرہ۔

[2] مطبوعہ "اسمہ"۔

[3] مخطوطہ "عـمـدة"۔

[4] دونوں فقرے اصل نسخے میں مٹے ہوئے تھے جیساکہ ناقل کی تصریح ہے۔

[5] مطبوعہ "عنى بہ"۔

جامع عتیق کے قدیم نسخہ "مصحف اسماء[1]" کے اوراق کثرتِ استعمال سے کمزور ہو رہے تھے۔ اس تازہ وارد نسخے کے بعد دونوں کی قرأت باری باری ہونے لگی لیکن خلیفۃ العزیز باللہ الفاطمی (م ۳۸۲ھ) کے زمانے میں ۵ محرم ۳۷۸ھ سے اس کی قرأت بند کر دی گئی۔ ابن المتوج کی مندرجہ بالا رائے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ نسخہ آٹھویں صدی ہجری کے اوائل تک غالباً الجامع العتیق ہی میں موجود رہا، بلکہ مقریزی کے سابق کلام سے واضح ہوتا ہے کہ خود اس نے اس مصحف کو دیکھا تھا۔

مدرسہ فاضلیہ کا نسخہ

چھٹی صدی ہجری میں مصحف کا ایک بیش قیمت نسخہ القاضی الفاضل عبد الرحیم بیسانی[2] (م ۵۹۶ھ) کو دستیاب ہوا۔ اس کا خط قدیم کوفی تھا۔ القاضی الفاضل نے اس نسخے کو مصحف عثمانی ہونے کی بنا پر تیس پینتیس ہزار دینار میں حاصل کیا تھا۔ مدرسۂ فاضلیہ جسے ۵۸۰ھ میں قاضی موصوف نے قائم کیا اور جس کے کتب خانے کو اپنا قیمتی ذخیرۂ کتب بخش دیا تھا، اس میں مصحف کا یہ قدیم نسخہ بڑے اہتمام سے محفوظ تھا۔ مقریزی کے عہد تک تقریباً کل نادر و منتخب کتابیں ختم ہو چکی تھیں۔ البتہ یہ مصحف اس وقت تک موجود تھا اور لوگوں میں اس کی شہرت مصحفِ عثمانی ہونے کی تھی۔ علامہ ابن الجزری[3] (م ۸۳۳ھ) اور آخر میں علامہ سمہودی (م ۹۱۱ھ) نے مصر میں جس مصحفِ عثمانی کو دیکھا تھا[4]۔ ہمارے لئے تعین کرنا مشکل ہے کہ وہ جامع عتیق کا نسخہ تھا، یا مدرسہ فاضلیہ کا۔

اندلس اور بلادِ مغرب کا نسخہ

قرطبہ کی جامع مسجد میں ایک مصحف چھٹی صدی کے وسط تک موجود تھا۔ جس کے متعلق مشہور تھا کہ حضرت عثمانؓ کے دستِ مبارک کا نوشتہ ہے۔ اس کی دلچسپ تفصیل "نفح الطیب" میں درج ہے۔

معلوم نہیں کس زمانے میں یہ نسخہ اندلس پہنچا۔ البتہ ابنِ خلدون رقمطراز ہیں کہ یہ مصحف بنو امیۂ اندلس کے خزانے میں تھا اور مقری کا بیان[5] ہے کہ اس کی جگہ جامع اعظم قرطبہ میں منبر کے پاس مقرر تھی۔ اس کی جلد نہایت

---

[1] اس نسخے کی کہانی دلچسپ ہے۔ عبد العزیز بن مروان (م ۸۶ھ) نے اس کی کتابت کروائی تھی۔ تفصیل کے لئے دیکھئے۔ المقریزی: الخطط (۴: ۱۷: ۱۹)

[2] المقریزی: الخطط (۴: ۱۹۷) الخطط التوفیقیہ (۶: ۱۳)

[3] عبد زرقانی: مناہل العرفان (۱: ۳۹۸)

[4] وفاء الوفا (۱: ۴۸۳)

[5] المقری۔ نفح الطیب (۱: ۹۵۶) مصر ۱۳۰۲ھ۔

مرصع و زرنگار تھی، غلاف دیبا کا تھا اور رحل عود کی، جس میں سنہری کیلیں تھیں۔

ابن خلدون نے اس کی پوری سرگزشت مختصر پیرائے میں یوں لکھی[1] ہے کہ یہ مصحف قرطبہ کے اموی خزانے سے ملوک الطوائف کے پاس پہنچا۔ پھر قبیلۂ لمتونہ کے روسا اس پر قابض ہوئے اور ان سے موحدین کے خزانے میں منتقل ہوا۔ صفر ۶۴۶ ہجری میں السعید علی بن المامون جب تلمسان کے قریب ناگہانی طور قتل کر دیا گیا، اور بنو عبد الواد اس کے خزائن پر لوٹ پڑے، تو السعید علی کے خزائن کے ساتھ یہ مصحف بھی یغمراسن ابن زیان کے قبضے میں آ گیا۔ ۷۳۷ ہجری میں جب ابوالحسن المرینی کا قبضہ تلمسان پر قائم ہوا تو آل زیان کے خزانہ کے ضمن میں یہ مصحف بنو مرین کو دستیاب ہوا اور ہنوز انہی کے خزانے کی زینت ہے۔

ابن خلدون سے بالکل مختلف انداز میں ہمیں خطیب ابن مرزوق[2] (م ۷۸۱ ھ) کا یہ بیان ملتا ہے کہ ۱۱ شوال ۵۵۲ھ کو ابن بشکوال (م ۵۷۸ ھ) نے اہل قرطبہ سے چھپا کر اس مصحف کو موحد سلطان عبد المومن بن علی کے پاس پہنچایا تھا۔ ہمارے نزدیک اس قصے میں ابن شکوال کا ترجمہ محلِ نظر ہے۔ اس لیے کہ مصحف کی منتقلی کے بارے میں جو تفصیل وزیر ابو بکر محمد بن عبد الملک بن طفیل کی زبانی منقول ہے۔ اس میں نہ تو ابن شکوال پر الزام ہے اور نہ مصحف کو قرطبہ کے لوگوں سے چھپا کر منتقل کرنے کا ذکر۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرطبہ کے دو معزز امیر ابو سعید اور ابو یعقوب کے ہمراہ اہل قرطبہ نے اپنی رضامندی سے اس مصحف کو سلطان عبد المؤمن کے پاس بھیجا تھا۔ سلطان نے اس کے لئے بڑا اہتمام کیا۔ دور دراز شہروں سے جوہری، نقاش، حکاک اور دوسرے ماہرین صنعت طلب کئے گئے اور مصحف شریف کی آرائش و ترصیع سے لے کر جلد، غلاف، رحل اور صندوق تک کے بنوانے میں ایسا اہتمام کیا گیا۔ جس کی تفصیل پڑھ کر حیرت ہوتی ہے۔ ابن رشید الفہری (م ۷۲۱ ھ) نے ان تمام تفصیلات کو مستقل رسالے کی شکل میں قلمبند کر دیا تھا۔ پورا رسالہ مقری کی "نفح الطیب" میں درج ہے[3]۔

---

[1] ابن خلدون، کتاب العبر (۷: ۸۳)

[2] نفح الطیب (۲۸) خطیب ابن مرزوق کا بیان مقری نے "کتاب المسند الصحیح الحسن فی مآثر مولانا ابی الحسن سے نقل کیا ہے۔ اس کتاب کے نسخوں کے لئے دیکھئے۔

(BROCKELMANN GAL. II, 239 SUPP. II 335-336)

[3] نفح الطیب (۱: ۲۸۳ - ۲۸۸)

سلطان عبدالمومن اور بعد کے موحد سلاطین برابر مصر میں بھی اس کو ساتھ رکھتے تھے۔ مشہور مؤرخ عبدالواحد مراکشی بھی اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ مصحف موحد سلاطین کے ہمراہ سفر میں ایک سرخ ناقہ پر تابوت کے اندر ہوتا تھا۔ اس کی آرائش میں بے انتہا دولت صرف کی گئی تھی۔ موحدین کے خزانے کا بے نظیر یاقوت "الحافر" جس کی قیمت کا اندازہ لگانے سے اس زمانے کے جوہری قاصر تھے، اسی مصحف میں جڑا ہوا تھا۔[1]

سلطان ابوالحسن مرینی تک پہنچنے کی جو کیفیت ابن خلدون کی تحریر سے ظاہر ہے، اس کی تصدیق ابن مرزوق کے بیان سے ہوتی ہے اور ایک نئی بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ جنگ طریف میں یہ مصحف ابوالحسن مرینی کے قبضے سے نکل کر پرتگالیوں کے قبضے میں چلا گیا لیکن ابوالحسن کو اس کے حصول کی فکر رہی۔ بالآخر سلطان کی تدبیریوں کارگر ہوئی کہ ۷۴۵ھ میں آزمودہ[2] کے ایک تاجر کے ذریعہ یہ متبرک نسخہ دوبارہ ابوالحسن مرینی کو حاصل ہو گیا۔

خطیب ابن مرزوق نے بلادِ مشرق کی سیاحت میں دمشق، مکہ اور مدینہ کے عثمانی مصاحف کی زیارت کی تھی۔ لہٰذا ان کو اندلسی مصحف کے پرکھنے کا خاصہ موقع ملا مگر افسوس یہ ہے کہ انہوں نے ان نسخوں سے مغربی نسخے کا موازنہ کرنے پر بھی کوئی مفصل تبصرہ نہیں کیا۔ ان کی صراحت اسی قدر ملتی ہے کہ مدنی اور مغربی نسخوں میں خطی مماثلت ہے۔ اس کے بعد انہوں نے اس عامیانہ خیال کی تردید کی ہے کہ یہ نسخہ حضرت عثمانؓ کا خود نوشت ہے۔ یہ خیال اندلس اور مغرب کی طرح مشرقی عوام میں بھی پھیلا ہوا تھا۔ چنانچہ ابنِ کثیر کو یہ صراحت کرنی پڑی[3]۔ ولیست کلہ بخط عثمان بل ولا واحد منہا۔

ابن فضل العمری[4] نے مسجد قرطبہ کے ذکر میں ایک مصحف کا تذکرہ کیا ہے جو قطعاً مذکورہ بالا نسخہ کے علاوہ تھا۔ اس میں چار ورق حضرت عثمانؓ کے خود نوشت مصحف کے تھے۔ یہ اوراق خون آلودہ تھے۔

جامع اُموی (دمشق) کے نسخے

شام میں دو نسخوں کا پتا چلتا ہے اور دونوں جامع بنی امیہ دمشق میں مختلف زمانوں میں محفوظ تھے۔ ان میں قدیم تر

ط۱ عبدالواحد المراکشی: المعجب ص ۱۸۲ طبع لندن ۱۸۸۱ء مجوعہ اماری ص ۲۲۱ ۱۸۵۷ء۔

ط۲ نفح الطیب میں "ازمود" ہے۔ تصحیح یاقوت سے کی گئی ہے۔ دیکھئے معجم البلدان (۱: ۲۳۳) طبع وستنفیلڈ۔

ط۳ البدایہ والنہایہ (۷: ۲۱۶)

ط۴ مسالک الابصار (۱: ۲۱۴) قاہرہ ۱۹۲۴۔

نسخے کا سراغ ۵۰۷ھ سے ملتا ہے۔ ابن تغری بردی نے امیر مودود فرمانروائے موصل کے واقعۂ قتل کی تفصیل بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ امیر مودود بزمانۂ قیامِ دمشق ہر جمعہ کو مصحفِ عثمانی کی زیارت سے برکت اندوز ہوا کرتے تھے بالآخر موقعہ سے فائدہ اٹھا کر ایک باطنی نے انہیں قتل کر دیا۔[۱]

ایک دوسرے قدیم نسخے کی اطلاع مشہور سیاح ابن جبیر اندلسی (م ۶۱۴ھ) کی زبانی ملتی ہے کہ "مقصورۂ حدیثہ" مشرقی رکن میں اندرون محراب ایک بڑا مخزن ہے۔ جس میں ایک مصحف حضرت عثمانؓ کا محفوظ ہے۔ یہ وہی نسخہ ہے۔ جسے حضرت عثمانؓ نے بلادِ شام کے لئے ارسال فرمایا تھا۔ روزانہ بعد نماز خزانہ کھلتا ہے اور مصحف کی نمائش ہوتی ہے۔[۲]

پھر ساتویں صدی کے وسط میں ایک مغربی فاضل ابوالقاسم تجیبی کی شہادت[۳] ملتی ہے کہ انہوں نے ۶۵۷ھ میں جامع اموی کے مقصورہ میں اس کو محفوظ پایا تھا۔ اسی نسخہ کی بابت ابن مرزوق اور ابن بطوطہ آٹھویں صدی کے اوائل میں اپنا اپنا مشاہدہ[۴] بیان کرتے ہیں۔ ابن مرزوق نے ۷۳۵ھ میں اسے دیکھا تھا۔ ابن بطوطہ کی درج کردہ تفصیل سے معلوم ہوتا ہے۔ اس کی نمائش صرف جمعہ کے دن ہوتی تھی اور نماز جمعہ کے بعد خزانہ کھلتا تھا۔

ابن فضل اللہ العمری[۵] (م ۷۴۹ھ) نے اسی نسخہ کی نشاندہی کی ہے لیکن سب سے الگ ہو کر اس کو حضرت عثمانؓ کا نوشتہ قرار دیا ہے۔ علامہ شبلی اسی مصحف کے سلسلہ میں "تہذیب[۶] الاخلاق کے ایک مضمون میں رقمطراز ہیں کہ یہ مصحف میرے سفر قسطنطنیہ کے زمانہ تک دمشق میں موجود تھا۔ کئی برس ہوئے جب سلطان عبدالحمید خاں کے زمانے میں جامع جل گئی، تو یہ مصحف بھی جل گیا۔

ھ۱ ابن جبیر، کتاب الرحلہ ص ۲۶۸ طبع لندن، ۱۹۰۷ء۔

ھ۲ اصل الفاظ یہ ہیں: "وتفتح الخزانة كل يوم اثر الصلوٰة۔" (ابن جبیر ص ۲۶۸) یوم کے بعد ایک لفظ ساقط ہے۔ "كل يوم جمعة" ہونا چاہیئے۔ دیکھئے ابن بطوطہ: تحفۃ النظار (۱: ۵۴)

ھ۳ نفح الطیب (۱: ۲۸۳)

ھ۴ " " ابن بطوطہ، تحفۃ النظار (۱: ۵۴) مصر ۱۹۳۸ء۔

ھ۵ مسالک الابصار (۱: ۱۹۵) طبع دار الکتب قاہرہ۔

ھ۶ بابت صفر ۱۳۲۹ھ، صحف سماویہ ص ۱۳۷ (۱۹۱۹ء)

واقعہ یہ ہے کہ سلطان عبدالحمید خاں کے عہد تک یہ نسخہ باقی نہیں رہا تھا، زیادہ سے زیادہ تیمور کے حملہ تک اس کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ تیمور کی موجودگی میں (۸۰۳ھ) جامع اموی میں چوتھی بار ایسی آگ لگی تھی کہ اس کی لپیٹ میں جامع مسجد کے قرب وجوار کی عمارتیں آ گئیں۔ اس میں تمام مصاحف اور قیمتی ذخیرے جل گئے تھے[1]۔ خاص طور پر اس مصحف کے بارے میں کسی قسم کی صراحت نہیں ملتی۔ تاہم اس کے بچ رہنے کا احتمال بہت ضعیف ہے۔ علامہ ابن جزری نے اس مصحف کو دیکھا تھا[2] مگر ہمارا خیال یہ ہے کہ انہوں نے اس واقعہ سے پہلے دیکھا ہوگا۔ ۱۳۱۰ھ میں بہ عہد سلطان عبدالحمید خاں[3] پھر آگ لگی اور ایک قدیم مصحف بخط کوفی جل گیا۔ لوگ اس کو مصحفِ عثمانؓ کہتے تھے۔

ہمیں نسخۂ بصری کے بارہ میں ابن فضل اللہ العمری کے یہاں "مبرك الناقة" کے ذکر میں یہ یادداشت ملتی[4] ہے۔ "وفی هذه الموضع مصحف شریف عثمانی وعلیه آثر الدم"۔ غالباً اسی نسخہ کا تذکرہ علامہ کرد علی نے کیا ہے۔

مکہ معظمہ کا نسخہ

مکہ معظمہ کے مصحفِ عثمانی کا قدیم تذکرہ ہمارے علم میں ابن جبیر کی کتاب "الرحلہ"[5] میں دو موقعوں پر آتا ہے۔ پہلی بار "قبۂ زمزم" کے قریب "قبۃ الشراب" اور "قبۃ الیہودیہ[6]" کے تعارف میں یہ بیان ملتا ہے کہ دونوں قبے بیت اللہ کے جملہ اوقات کے مخزن تھے، اور

---

[1] کرد علی خطط الشام (۵ : ۲۷۹) دیکھئے یزدی : ظفرنامہ (۲ : ۳۳۹) کلکتہ ۱۸۸۰ء مصاحف اور کتابوں کے جلنے کا ذکر یزدی نہیں کرتا۔

[2] زرقانی مناہل العرفان (۱ : ۲۹۸)

[3] شیخ ابن بدران (م ۱۳۴۶ھ) نے آتشزدگی کا واقعہ ۱۳۱۱ھ میں لکھا ہے۔ دیکھئے ابن عساکر، تہذیب، تاریخ دمشق (۱ : ۲۰۴-۲۰۵) حاشیہ رقم۔

[4] مسلک الابصار (ص ۲۱۶-۲۱۷)

[5] کتاب الرحلہ (ص ۱۰۴-۱۶۰)

[6] ابن جبیر سے پیشتر حرم شریف کا تفصیلی جائزہ جن لوگوں کے یہاں ملتا ہے۔ ان کی تحریروں میں قبۃ الشراب (القبۃ العباسیہ) اور قبۃ الیہودیہ کے نام نہیں ملتے۔ ناصر خسرو کے یہاں سقایۃ الحاج اور خزانۃ الزیت کا تذکرہ ملتا ہے (ناصر خسرو، سفرنامہ

(بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

خاص طور پر" قبۃ الشراب"، جس کو حضرت عباس کی نسبت سے" القبۃ العباسیہ" بھی کہتے ہیں قرآنِ کریم کے نسخوں اور کتابوں کا مخزن تھا۔ یہیں ایک بہت بڑے تابوت کے اندر بڑی تقطیع کا ایک قدیم مصحف خلفائے اربعہ میں سے کسی ایک کے زمانے کا محفوظ تھا۔ جس کی کتابت حضرت زید بن ثابتؓ نے نبی اکرمؐ کی وفات سے ۱۸ سال بعد (۲۹ھ) میں کی تھی۔ اس کے بہت سے اوراق ضائع ہو چکے تھے۔ اس کی دونوں دفتیاں لکڑی کی تھیں۔ ابن جبیر نے اس نسخے کو بڑی عقیدت مندی کے ساتھ دیکھا تھا، اور" قبۂ عباسیہ" کے متولی سے ان کو معلوم ہؤا تھا کہ قحط و گرانی کے زمانہ میں اہل مکّہ اس نسخہ شریفہ کو باہر نکالتے ہیں اور بیت اللہ کی چوکھٹ اور مقامِ ابراہیمؑ[۱] کے درمیان رکھ کر دعا کرتے ہیں۔ جس کا اثر بہت جلد نمایاں ہو جاتا ہے۔ ابن جبیر نے خود ہی اس قسم کے ایک اجتماع کا نظارہ کیا۔ چنانچہ دوسرے موقع پر رقمطراز ہیں کہ ۲۲، شوال ۵۷۹ھ مطابق ۶، ماہِ فروری ۱۱۸۳ء کو اہل مکّہ کا اجتماع نمازِ استسقاء کے لئے ہؤا۔ نماز سے پہلے قاضی مکّہ نے خزانے سے مصحف عثمانی کو نکالا اور مقامِ ابراہیم کے آگے اس طور پر کھول کر رکھ دیا کہ اس کی ایک دفتی مقام مطہر پر اور دوسری دفتی بیت اللہ کی چوکھٹ پر جا پڑی۔

یہ بیان پہلی یادداشت سے قدرے مختلف ہے۔ یہاں مصحف کی نسبت حضرت عثمانؓ کی طرف بصراحت کی گئی ہے۔ پہلی یادداشت میں بھی نسخے کی جو تاریخ[۲] غالباً متولی قبۂ عباسیہ سے سن کر لکھی گئی ہے۔ وہ عہدِ عثمانی کو

ط[۱] ابن جبیر کے الفاظ سے واضح ہوتا ہے کہ وقتی طور پر مقامِ ابراہیم کو مقررہ جگہ سے باب الکعبہ کے قریب اٹھا لاتے تھے۔

ط[۲] ابن جبیر کے الفاظ سے یہ پتا نہیں چلتا کہ سال کتابت مصحف کے اندر کہیں ثبت تھا یا قبۃ العباسیہ کے متولی کی زبانی معلوم ہؤا تھا، عہد عثمانی یا اس کے بعد کچھ مدت تک ہمارا خیال ہے کہ قرآنی نسخوں کے اوّل یا آخر میں کوئی ایسی تحریر (بقیہ فٹ نوٹ اگلے صفحہ پر)

بقیہ صـ ۱۵۷

ص ۹۹ (تحقیق محمد زبیر سیاقی تہران) ابن جبیر نے سقایۃ الحاج کو قبۃ الشراب اور خزانۃ الزیت کو قبۃ الیہود کا نام دیا ہے؛ ابن بطوطہ کے عہد تک یہی دونوں نام مشہور تھے۔ یاقوت کی معجم البلدان میں ان میں سے کسی ایک کا بھی اندراج نہیں ہے۔ ابن ظہیرۃ المخزومی نے بظاہر الفاسی کے حوالہ سے قبۃ الشراب کا ذکر قبۃ الیہود کے نام سے اور قبۃ الیہود کا ذکر سقایۃ العباس کے نام سے کیا ہے جو ناصر خسرو، ابن جبیر اور ابن بطوطہ کی دی ہوئی تفصیلات کے خلاف ہے۔ دیکھئے الجامع اللطیف ص ۲۱۵۔ (مصر ۱۹۳۸ء)

متعین کر دیتی ہے لیکن اس کے ساتھ ہی "مصحف احد الخلفاء الاربعة" کے الفاظ بہت عجب ہیں۔ بہر حال یہ ساری باتیں عام شہرت کی بناء پر بیان کی گئی ہیں۔ تاہم نسخے کی قدامت میں خود ابن جبیر کو شک نہیں تھا۔ جیسا کہ ان کی پیش کردہ تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے۔

ابن جبیر کے بعد ابوالقاسم تجیبی کی شہادت ہے کہ ۶۵۷ھ میں انہوں نے "قبة الیهودیة" جس کو "قبتہ الشراب" بھی کہتے تھے[1]، اس کی زیارت کی تھی۔ پھر ۷۳۵ھ میں ابن مرزوق نے اس نسخۂ شریفہ کو دیکھا تھا[2] اور مشہور سیاح ابن بطوطہ بھی اس کا ذکر تفصیل[3] کے ساتھ کرتا ہے۔ ابن بطوطہ کا بیان تقریباً لفظ بہ لفظ ابن جبیر سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ البتہ اس کی عبارت میں نہ حضرت عثمانؓ کا نام آتا ہے اور نہ "أحد الخلفاء الاربعة" کے الفاظ ملتے ہیں۔ غالباً یہی نسخہ علامہ سمہودی (م ۹۱۱ھ) کے بعد تک مکہ معظمہ میں موجود تھا[4]۔

مسجد نبوی کا نسخہ

مدینہ منورہ کے قدیم مؤرخین کی جو یادداشتیں مسجد نبوی کے بارے میں علامہ سمہودی کے سامنے تھیں۔ ان میں حضرت عثمانؓ کے مصاحف میں سے کسی نسخہ کا تذکرہ نہیں ملتا تھا۔ اندلسی سیاح ابن جبیر ہی کو یہ اولیت حاصل ہے کہ ۵۸۸ھ میں زیارتِ مدینہ سے مشرف

---

1. نفح الطیب ص ۲۸۲ قبتہ التراب (بالتاء المثناة الفوقانیہ) تصحیف مطبعی ہے، یہ بھی ملحوظ رہے کہ تجیبی نے قبتہ الشراب اور قبتہ الیہود کو ایک قرار دیا ہے، اس لئے کہ دونوں متصل تھے اور اوقاف حرم کے مخزن کا کام دیتے تھے ورنہ صحیح یہ تھے کہ قبتہ الیہود کے بجائے قبتہ العباسیہ اور قبتہ الشراب کو ایک قرار دیتا تھا۔
2. نفح الطیب (۲: ۲۸۳)
3. تحفتہ النظار (۱: ۱۸۴) اس نسخہ کی زیارت ابن بطوطہ نے غالباً (۷۲۷) ہجری میں کی ہوگی۔
4. وفاء الوفا (۱: ۴۸۲)

(بقیہ گذشتہ ورق سے) لکھی نہیں جاتی تھی لیکن عہدِ اموی کے اواخر تک اس قسم کی تحریر کا رواج ہو چکا تھا ابوعمرو الدانی (م ۴۴۴ھ) کی نظر سے ایک ایسا مصحف گزرا تھا۔ جس کی کتابت ہشام بن عبدالملک کے اوائل خلافت میں مغیرہ بن میناء نے کی تھی، نسخہ کے آخر میں بطور ترقیمہ یہ الفاظ تھے۔ "کتبہ، مغیرہ بن مینا فی رجب سنتہ مائتہ و عشر۔" دیکھئے المحکم فی نقط المصاحف، ص ۸۷، دمشق ۱۹۶۰ء)

ہو کر جو روداد انھوں نے قلمبند کی، اس میں حجرۂ مبارکہ اور مقام النبیؐ کے درمیان مصحفِ عثمانی کی جگہ متعیّن کر کے بتائی ہے[1]
اور اس بات کی صراحت کردی ہے کہ یہ نسخہ ان مصاحف میں سے ایک ہے جو حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں مدینہ سے باہر بھیجے گئے۔ مشہور مؤرخ ابن النجار بغدادیؒ (م ۶۴۲ھ) کی تاریخ مدینہ میں موقع و محل کے اعتبار سے گویا اسی مصحف کا ذکر ملتا ہے[2] لیکن ابن النجار نے اس کو عہدِ عثمانی سے منسوب نہیں کیا۔ ابن النجار کے ذریعہ سے یہ نئی اطلاع ملتی ہے کہ قرآنِ کریم کا یہ نسخہ مسجد نبویؐ کے لئے مصر سے بھیجا گیا تھا۔

ابن جبیر کے بعد خطیب ابن مرزوق نے اس نسخے کو مصحف عثمانی قرار دیا ہے۔ انھوں نے ۷۳۵ھ میں اسے دیکھا تھا، سرورق پر بہ قول خطیب مذکور عہدِ عثمانی کے مرتّبین و کاتبینِ مصحف کے نام ان الفاظ میں درج تھے۔"ھذا ما أجمع علیہ جماعۃ من أصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منھم زید بن ثابت وعبد اللہ بن الزبیر وسعید بن العاصی" اور یہ تحریر بھی ثبت تھی۔ "وقال النخعی لعلہ الکوفی او البصری"[3] کاتبین مصحف کے نام یقیناً بعد میں کسی نے لکھے ہوں گے۔ اس لئے کہ عہدِ صحابہؓ میں بین الدفتین اس قسم کی تحریروں کے لئے کوئی گنجائش نکل نہیں سکتی تھی۔ اس تحریر سے نسخے کی تاریخی اہمیت مشکوک ہو جاتی ہے دوسری تحریر سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کسی شخص کو اس نسخے کی تحقیق کا داعیہ پیدا ہوا ہوگا۔

خطیب ابن مرزوق کے ایک معاصر[4] محمد بن احمد المطری (م ۷۴۱ھ) نے اپنی تاریخ مدینہ میں اس کا ذکر مصحف عثمانی کی حیثیت سے کیا ہے۔ سمہودی کے عہد تک عام طور پر مشہور تھا کہ یہی نسخہ حضرت عثمانؓ کا مصحف خاص ہے۔ اس کا ثبوت اسی قدر تھا کہ آیت " فسیکفیکھم اللہ " پر خون کے نشانات تھے۔ علامہ سمہودی[5] (م ۹۱۱ھ) اس کو مصحفِ خاص قرار نہیں دیتے کہ اس خصوصیت کے حامل مکہ معظمہ اور قاہرہ میں قرآنِ پاک کے دو قدیم نسخے ان کی نظر

---

1. کتاب الرحلہ ص ۱۹۳، وفاء الوفا (۱: ۴۸۲)
2. وفاء الوفا (۱: ۲۸۱)
3. نفح الطیب (۱: ۲۸۳)
4. وفاء الوفا (۱: ۴۸۲)
5. ایضاً (۱: ۴۸۲ - ۴۸۳)

گزرے تھے۔ ان کی رائے میں مصحفِ خاص سے مشابہت پیدا کرنے کے لئے بعد میں نسخوں کے اندر آیت مذکور "غلوق" کے ذریعہ رنگ دی گئی ہوگی۔ ان مصاحف کے بارہ میں وہ زیادہ سے زیادہ یہ تسلیم کرنے کو تیار نظر آتے ہیں، کہ حضرت عثمانؓ کے ارسال کردہ ہوں گے۔ ان نسخوں کے علاوہ مزید تین نسخے ہمارے علم میں عہدِ عثمانیؓ سے منسوب تھے۔ ان کا تذکرہ مختصر طور پر ذیل میں کیا جاتا ہے:-

سنہ ۶۵۳ھ میں خلیفہ معتصم اللہ (م ۶۵۶ھ) کی ایک بیگم کے حکم سے مدرسۂ بشیریہ کی عمارت تکمیل کو پہنچی اور اس کا افتتاح خود خلیفہ نے شہزادوں اور اعیان دولت کے جلو میں کیا تھا۔ خلیفہ کی طرف سے نادر و نایاب نسخے ۳۶ صندوقوں میں بھر کر اس مدرسے کے کتب خانے کے لئے عطا ہوئے۔ ان میں ابن مقلہ اور ابن البواب کے نوشتہ دفاتر اور قرآن کریم کے دو نادر نسخے بھی، ایک نسخے کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ خود حضرت عثمانؓ کے دست مبارک کا نوشتہ تھا۔[۱]

رمضان سنہ ۶۶۱ھ میں الملک الظاہر بیبرس[۲] نے ملک برکہ خان تاتاری، فرمانروائے قبچاق کو ہدایا و تحائف بھیجے تھے، ان کی فہرست میں ابن واصل، مصنف "مفرج الکروب فی أخبار بنی ایوب" نے ایک مصحف کا تذکرہ کیا ہے جو حضرت عثمانؓ کا نوشتہ تھا۔

آٹھویں صدی کے سیاح[۳] ابن بطوطہ (م ۷۷۹ھ) نے بصرہ کی سیاحت میں مسجد امیر المومنین علیؓ کا ذکر کرتے ہوئے بیان کیا ہے کہ اس خزانے میں حضرت عثمانؓ کا مصحفِ خاص موجود تھا، جس کے اوراق خون آلود تھے۔

اس عہد کے محققین میں سے استاد طاہر الکروی نے حجاز و مصر کے کتب خانوں میں مصحفِ عثمانی کی جستجو کی تھی لیکن ان کو کامیابی نہیں ہوئی۔ مصحف مدینہ میں جس کا وجود دسویں صدی کے اوائل تک بہ شہادت سمہودی ثابت ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں بھی طاہر الکردی نے تحقیق کرنی چاہی مگر ان کو اس سے زیادہ معلوم نہ ہو سکا کہ ۱۳۳۴ھ میں جب ترک حرمین سے بے دخل ہوئے تو غالباً یہ نسخہ استنبول منتقل ہو گیا۔[۴]

علامہ کرد علی نے جامع ایا صوفیہ استنبول[۵] کے ایک مصحف کی بابت اپنے دوست شیخ مسعود الکواکبی کا بیان

۱ھ تحفۃ الاصحاب ورق ۲۰۸ ظ (مخطوطہ مجمع ایشیاٹک کلکتہ (رقم: ۴۸۹ عربی) یہ عبارت ذہبی تاریخ الاسلام سے ماخوذ ہے۔

۲ھ سخاوی: السلوک فی معرفۃ دول الملوک قسم ثانی (۱: ۴۹۷) تحقیق مصطفیٰ۔ زیادہ طبع قاہرہ ۱۹۳۶ء۔

۳ھ تحفۃ النظار (۱: ۱۱۶) طبع مصر۔

۴ھ تاریخ القرآن و غرائب رسمہ، ص ۱۱۱-۱۱۲ (مصر ۱۹۵۳ء)

۵ھ کرد علی خطط (۷: ۱۸۹)

نقل کیا ہے کہ سرورق پر "حررہٗ عثمان بن عفان" کے الفاظ مکتوب تھے اور اس کی زیارت کا موقعہ ان کو کئی بار ملا تھا لیکن، استنبول کے نوادر و مخطوطات کی نمائش، جو ستمبر ۱۹۵۱ء میں مؤتمر مستشرقین کے انعقاد کے موقع پر ہوئی تھی، اس کی جس قدر تفصیلات[۱] ہماری نظر سے گزری ہیں۔ ان میں کسی ایسے مصحف کا تذکرہ نہیں ملتا، جو خاص طور پر حضرت عثمانؓ کے عہد سے منسوب کیا گیا ہو۔

استاد طاہر الکردی نے مصحف مدینہ کے سلسلے میں مصری ہفتہ وار[۲] "الدنیا دکل شیٔ" کے حوالہ سے یہ اطلاع نقل کی ہے کہ یہ مصحف ترکوں کے ذریعہ جرمن شہنشاہ غلیوم ثانی کو ملا تھا۔ اس کی واپسی کے لئے حکومت المانیہ ایک معاہدے کے تحت آمادہ تھی اور چھ ماہ کے اندر حکومت حجاز کو لوٹا دینے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کردی نے اس خبر کو غیر مصدقہ قرار دیا ہے۔

ایک مصری فاضل شیخ عبد العظیم زرقانی[۳] کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ قرانِ کریم کے کئی قدیم نسخے مصری دار الآثار اور کتب خانوں کی زینت ہیں اور حضرت عثمانؓ سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ زرقانی ان نسخوں کا انتساب عہدِ عثمانی سے صحیح نہیں سمجھتے۔ اس لئے کہ یہ تمام نسخے نقش ونگار اور زرکشی کے کام سے آراستہ ہیں۔ البتہ مسجد حسینی کے ایک قدیم مصحف سے انہوں نے بحث کرنے کی ضرورت سمجھی کہ بعض خطی شواہد کی بنا پر یہ نسخہ، مصحفِ مدنی اور مصحفِ شامی سے مطابقت رکھتا ہے۔ ان کا اندازہ ہے کہ یہ نسخہ ان دو عثمانی نسخوں میں سے کسی ایک کی نقل ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ نے کسی زمانے میں دار المصنفین اعظم گڑھ کو یہ اطلاع دی تھی کہ مصحف عثمانی کا عکس زار روس نے شائع کیا تھا۔ اسی سلسلے میں چند ماہ پیشتر ان کا ایک مکتوب[۴] "معارف" اعظم گڑھ میں شائع ہوا۔ جس میں ڈرہم یونیورسٹی کے نسخے کی نشاندہی کی گئی ہے۔

ایک روسی عکس کا تعارف قاضی اطہر مبارک پوری کے مضمون سے حاصل[۵] ہوتا ہے۔ یہ صرف "سورۂ یسین" کا عکس

---

[۱] رسالہ "معارف" (اعظم گڑھ) (۶۹: ۲۱۶-۲۲۸)، (۷۰: ۱۶۵-۱۸۴)

[۲] مورخہ ۲۷ جمادی الثانیہ ۱۳۵۷ھ مطابق ۲۴ اگست ۱۹۳۸ء۔

[۳] مناہل العرفان (۱: ۳۹۸)

[۴] رسالہ "معارف" اعظم گڑھ (۸۶: ۴۴۹-۴۵۰)

[۵] ایضاً، جنوری ۱۹۶۱ء۔

ہے۔ جس کی اشاعت فوٹو بلاک کے ذریعہ ۱۹۰۵ء میں ایک روسی عالم عبد اللہ الیاس بورغانی قریمی نے کی تھی۔ ان کی نظر سے یہ مصحف پیٹرس برگ کے شاہی کتب خانے میں ۱۸۸۹ء میں گزرا تھا۔ دوبارہ ۱۹۰۵ء میں انہوں نے "سورۂ یٰسین" کا فوٹو لیا اور اس کی اشاعت بڑے اہتمام سے کی۔ اصل نسخہ بقول بورغانی خطِ کوفی میں چمڑے پر لکھا ہوا ہے اور اس کے صفحات کو کنارے کی طرف بڑھا کر کے دیکھا جائے تو حروف شیشے کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نیز آیت شریف "فسیکفیکھم اللہ" پر خون کے دھبے موجود ہیں۔ مضمون نگار نے جملہ تفصیلات کے بعد لکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ مکمل نسخہ بعد میں ڈرہم یونیورسٹی میں منتقل ہو گیا ہو لیکن اگر یہ مکمل نسخہ روس میں ہوتا تو کمیونسٹ حکومت ضرور اس کا پروپیگنڈہ کرتی۔

مگر واقعہ یہ ہے کہ مملکت روس کے قبضے میں اس مصحف کا وجود ۱۹۵۹ء تک روسی اطلاعات[1] کے ذریعہ ثابت ہوتا ہے اور اس کی تاریخ کے بارے میں بعض ایسی تفصیلات ملتی ہیں، جن کا ذکر شیخ عبد اللہ بورغانی قریمی کی تحریر میں نہیں ہے۔ روسی اطلاعات کا خلاصہ یہ ہے کہ مصحفِ عثمانی تیمور کے کتب خانہ میں تھا جو ۱۳۹۳ء میں دارالامارۃ سمرقند میں قائم کیا گیا تھا۔ پھر معلوم نہیں کن حالات کے تحت کتب خانے سے نکل کر سمرقند کی مسجد خواجہ احرار میں آ گیا اور صدیوں تک اس مسجد میں ایک مرمریں ستون سے زنجیروں کے ذریعہ معلق رہا۔ ۱۸۶۸ء میں روسی شہنشاہیت بخارا پر قابض ہوئی اور غالباً روسی استیلاء کے بعد ہی ترکستان کے روسی گورنر جنرل (وان کاف مان) نے اس کو سو روبل میں خرید کیا اور پیٹرس برگ کے شاہی کتب خانے کو بطور تحفہ دے دیا۔

۱۹۱۷ء میں روسی انقلاب کے بعد انقلابی دستے کے مسلمان سپاہیوں نے اس کو اپنے قبضے میں کر لینا چاہا مگر عارضی حکومت کی فوج نے ان کو اس سے باز رکھا۔ بالآخر پیٹر وگراڈ صوبائی مسلم کانگریس نے اس کی واپسی کا مطالبہ کیا اور مجلس وزراء کے حکم نامہ مؤرخہ ۹ دسمبر ۱۹۱۷ء کے مطابق یہ تاریخی مصحف روسی پارلیمان کے مسلم نمائندوں کے جلسہ میں اوفا پہنچا۔ پھر اسے تاشقند لایا گیا جو اس وقت ازبکستانی جمہوریہ کا پایۂ تخت ہے۔ روسی نشریہ میں خون کے نشانات کا ذکر کیا گیا ہے اور اس بات کی صراحت کی گئی ہے کہ روسی مستشرقین نے اس کی قدامت تسلیم کی ہے۔

ان اطلاعات کی روشنی میں یقین کرنا پڑتا ہے کہ روسی نسخہ ڈرہم یونیورسٹی کو منتقل نہیں ہوا اور دونوں نسخے جداگانہ ہیں۔ (ختم شد)

ح[1] رسالہ "سوویٹ دیس" (۲:۶) بابت جنوری ۱۹۵۹ء۔

معصومی صاحب کا مقالہ یہاں ختم ہو جاتا ہے۔ سویٹ روس کا ایک اُردو ماہنامہ 'طلوع' کے نام سے کراچی (پاکستان) سے شائع ہوتا ہے۔ اس کے جنوری ۱۹۷۴ء کے شمارہ میں مصحفِ عثمانی کے متعلق ایک اطلاعنامہ شائع ہوا تھا، جسے درج ذیل کیا جاتا ہے۔

"حضرت عثمانؓ کے قرآنِ پاک کے مشہور و معروف نسخے کی فوٹوں کاپیاں بھی لائبریری میں موجود[1] ہیں۔ قرآن شریف کا یہ نسخہ خطِ کوفی میں ہے جو خلیفۂ سوم حضرت عثمانؓ کے عہدِ حکومت میں تحریر کیا گیا تھا۔ اصل نسخے کو تاشقند میں ایک خصوصی الماری میں محفوظ رکھا گیا ہے۔ حضرت عثمانؓ کا قرآن شریف کا یہ نسخہ عربی رسم الخط کا ایک نادر نمونہ ہے۔ یہ بارہ سو سال سے زیادہ پرانا ہے۔ پہلی صدی ہجری کی چھٹی دہائی میں (۶۵۱ھ[2]) جدید قرآن کا پہلا باضابطہ نسخہ بڑے خط میں تحریر کیا گیا۔ اصل نسخے کی تین نقول دمشق، کوفہ اور بصرہ بھیجی گئیں، جبکہ اصل نسخہ مدینہ میں خلیفہ سوم حضرت عثمانؓ کے پاس محفوظ رہا۔

مشہور عرب سیاح ابن بطوطہ (۱۳۰۴ء - ۱۳۷۷ء) نے لکھا ہے کہ عراق میں انہوں نے حضرت عثمانؓ کے قرآنِ مجید کے نسخے کی دو نقول دیکھی تھیں، ایک تو دمشق میں اور دوسری بصرہ میں حضرت علیؓ کی مسجد میں جس پر خون کے چھینٹے تھے۔ ان میں پہلا نسخہ تو دمشق میں آگ میں جل گیا جبکہ دوسرے نسخے کو تیمور بصرہ سے سمرقند لے آیا۔ جہاں وہ تقریباً چار سو سال تک رکھا رہا۔ جب وسط ایشیا کا علاقہ روس کی سلطنت میں شامل ہو گیا تو زارِ شاہی کے افسروں نے اس نسخے کو خرید لیا اور اسے سینٹ پیٹرزبرگ کی امپریل پبلک لائبریری میں بھیج دیا گیا۔ انقلاب اکتوبر کے بعد ایک خصوصی فرمان کے تحت اس نادر مسودے کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا گیا۔ دسمبر ۱۹۱۷ء سے لے جولائی ۱۹۲۳ء تک قرآن پاک کے اس نسخہ کو اوفا میں اور ۱۹۲۳ء کے بعد سے تاشقند میں محفوظ رکھا گیا۔

اس الماری کو جس میں حضرت عثمانؓ کے قرآن شریف کا یہ نسخہ محفوظ ہے، بہت ہی کم کھولا جاتا ہے۔ اس منفرد نسخے کو محفوظ رکھنے کے لئے خصوصی انتظامات کئے گئے ہیں۔ چند سال پہلے غیر ملکی

---

[1] یعنی ماسکو کی لائبریری میں۔ (پرویز)

[2] حضرت عثمانؓ کا عہد خلافت ۶۴۴ء لغایت ۶۵۶ء تھا۔ (پرویز)

مہمانوں کے لئے جن کا تعلق اہل اسلام کے ایک وفد سے تھا۔ اس الماری کو کھولا گیا تاکہ وہ اس بیش قیمت نسخے کی زیارت کر سکیں۔ غیر ممالک سے سینکڑوں مہمان، سیاح اور عالم مشرق کی بیش قیمت ثقافتی یادگاروں کو دیکھنے کے لئے تاشقند آتے ہیں"۔

اس اطلاعنامہ میں کہا گیا ہے کہ "چند سال پہلے غیر ملکی مہمانوں کے لئے جن کا تعلق اہلِ اسلام کے ایک وفد سے تھا، اس الماری کو کھولا گیا تاکہ وہ اس بیش قیمت نسخے کی زیارت کر سکیں"۔ غالباً اس میں اس وفد کی طرف اشارہ ہے جو ۱۹۶۵ء میں زیرِ قیادت (اس زمانے کے صدر مملکت پاکستان) محمد ایوب خاں (مرحوم) روس گیا تھا۔ وہاں انہیں اس مصحف کا ایک (مکمل) عکسی نسخہ بطور تحفہ دیا گیا تھا۔

۱۴ مارچ ۱۹۷۶ء کے روزنامہ ڈان (کراچی) میں H.A. HAMID صاحب کا ایک مقالہ شائع ہوا تھا۔ جس میں انہوں نے اس نمائشِ کتب کی تفصیل دی تھی جو نیشنل میوزیم (کراچی) میں 'انٹرنیشنل سیرت کانگریس کی تقریب پر منعقد کی گئی تھی اس میں مصحف عثمانی کا وہ عکسی نسخہ بھی تھا، جسے صدر ایوب خاں (مرحوم) روس سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس ضمن میں صاحبِ مقالہ نے لکھا تھا:۔

"قرآنِ کریم کا یہ نسخہ، جو قدیم کوفی رسم الخط میں مرقوم ہے، وہ ہے جسے خلیفۂ ثالث (حضرت عثمانؓ) نے مصر بھیجا تھا، اور اس کے بعد وہ بغداد پہنچ گیا تھا۔ ازاں بعد اسے حضرت شیخ ابوبکر محمد بن علی القیقل الشاشمانیؒ، جن کی اہل بغداد کی نظروں میں بڑی قدر و منزلت تھی، بطور تحفہ تاشقند بھیج دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے وقت یہ نسخہ ان کے زیرِ تلاوت تھا۔ جب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں (مرحوم) روس تشریف لے گئے ہیں تو انھیں یہ نسخہ تحفۃً دیا گیا تھا"۔

یعنی اب وہ عکسی نسخہ نیشنل لائبریری، کراچی کی وجۂ زینت و افتخار ہے۔

ہم نے اس نسخہ (یا ان قدیم ترین نسخوں) کی اس علمی تحقیق کو اس کی تاریخی اہمیت کے پیشِ نظر درجِ کتاب کیا ہے، ورنہ قرآنِ کریم کی محفوظیت کے لئے وہ داخلی و خارجی شہادات کافی ہیں، جنھیں پہلے درج کیا جا چکا ہے۔ ان شہادات کی بھی غیر مسلموں کے لئے ضرورت پڑتی ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، ان کا خدا کے اس دعویٰ پر ایمان ہے کہ:۔ اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (۱۵/۹)۔ "ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں"۔

ہمارے لئے اس کے بعد کسی شہادت کی ضرورت نہیں رہتی۔ والسّلام ، پرویز

طبع کردہ: النّور پرنٹرز و پبلشرز
۳/۲ فیصل نگر۔ پوسٹ بکس ۴۱۹۰۔ لاہور ۲۵